نظام اردو خطبات، دہلی یونی ورسٹی

۱۹۶۷ء

ہندوستانی کلچر کا ارتقا

تاریخ کے آئینے میں

ڈاکٹر تاراچند

شائع کردہ شعبۂ اردو۔ دہلی یونی ورسٹی۔ دہلی

سلسلۂ مطبوعات شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی

ہندوستانی کلچر کا ارتقا تاریخ کے آئینے میں

ڈاکٹر تارا چند

اشاعت اول

اگست ۱۹۶۷ء

مطبوعہ : جمال پریس۔ دہلی

قیمت : دو روپے پچاس پیسے

ترتیب

خطبۂ اوّل: ۳؍ مارچ ۱۹۶۷ء

صدر: جناب ڈاکٹر سی، ڈی، دیش مکھ، سابق وائس چانسلر دہلی یونی ورسٹی

UNIVERSITY OF DELHI

FOREWORD

The Annual Nizam Urdu lectures were instituted last year in the University of Delhi on the basis of a munificent grant from the Nizam Trust which has formed the corpus of a permanent chdowment for these annual lectures. I am happy to write these few lines on the occasion of the publication of the second series of these annual lectures delivered by our eminent historian and educationist, Dr. Tara Chand.

It was singularly appropriate that the Nizam Urdu lectures were inaugurated by our learned President, Dr. Zakir Husain, who was then Chancellor of our University. I recall his pregnant remark that the most effective way in which our scholars can contribute to the communication of knowledge for the benefit of the citizen is to present their research in the indigenous languages so that the common man may share the fruits of this labour. I am happy to say that the task set by him has been worthily accomplished by Prof. K.G. Saiyidain who delivered the first series of lectures on the subject of the philosophical quest of man and by Dr. Tara Chand who has presented, in the present series, an illuminating survey of the panorama of Indian culture through the ages. He has admirably analysed the basic traits of our culture and revealed the interweaving of various strands which make up the texture of our composite Indian Culture. He has illustrated with a wealth of detail how Indian people have imbibed the values of other civilizations with whom they have come in contact and incorporated them into the rich tapestry of their own culture values.

DELHI,
August 9, 1967.

(B. N. GANGULI)
Vice-Chancellor.

تعارفی تقریر

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

صدر گرامی منزلت۔ وائس چانسلر صاحب۔ پروفیسر
تارا چند صاحب۔ اراکینِ مشاورتی کمیٹی نظام اُردو خطبات۔
مہمانانِ گرامی۔ خواتین و حضرات!

ابھی نظام اردو خطبات کے جلسے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اخبارات نے اعلیٰ حضرت نظام کی وفات کی اندوہ ناک خبر سنائی۔ ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ موصوف نے نصف صدی سے زیادہ ہمارے علمی اداروں اور ادبی حلقوں کو متاثر اور اپنے فیض سے دور و نزدیک کے علاقوں کو سیراب کیا ہے۔ خود یہ نظام خطبات ہمارے دعوے کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اس لیے ممدوح کی موت دراصل علم فضل شعر و ادب کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے جس پر علمی مراکز جس قدر مغموم و متاسف ہوں کم ہے۔ نظام دکن کی ذات اور حکومت دونوں میں مغلوں کی تہذیب اور ثقافت کا عکس ضوفگن تھا۔

میں نے ابتدائی جملوں میں اعلیٰ حضرت کی وفات کا ذکر کیا ہے مگر حیاتِ جاوید کا تعلق جسم ظاہر کی بقا اور فنا سے مطلق نہیں۔ بلکہ انسان کے کارنامے ہیں جو اس کو جاوداں بناتے ہیں۔ اس دنیا میں " فکرِ بیدار قلبِ گداز

اور عمل پیہم" کی ضرورت ہوتی ہے۔ عظیم شخصیتوں کے کام ہی ان کے نام کو بقائے دوام بخشتے ہیں۔ سقراط سے کسی نے اس کی عمر دریافت کی۔ اس نے چار پانچ سال اپنی عمر بتائی۔ جس پر استفسار کرنے والے کو قدرۃً استعجاب ہوا۔ اس مرد دانا نے کہا کہ اصل عمر وہ ہے جو خالق کی یاد یا مخلوق کی خدمت میں بسر ہو۔ باقی اوقات کو حسابِ عمر میں شمار کرنا نادانی ہے۔

لائق احترام اور عظیم ہیں وہ روحیں، جن کا نام جب لیا جائے تو قلوب جوشِ عقیدت سے لبریز ہوجائیں اور زبانیں بے ساختہ پکار اٹھیں: "تمھاری خوبیاں زندہ تمھاری نیکیاں باقی"

حضرات! آپ سب آگاہ ہیں کہ خانوادۂ آصفیہ نے بالعموم اور اعلیٰ حضرت نظام نے بالخصوص علوم وفنون فضل وحکمت شعر وادب کی جو سرپرستی اور ہمت افزائی فرمائی ہے وہ ہماری علمی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔ کیا موصوف کی قائم کردہ عثمانیہ یونی ورسٹی کی خدمات، دائرۃ المعارف اور دار الترجمہ کی فتوحات اور اردو نوازی کی روایات فراموش کی جاسکتی ہیں۔ عثمانیہ یونی ورسٹی اور اُردو ہی پر موقوف نہیں بلکہ خاندان آصف جاہی کا سحاب کرم ہمیشہ ہمارے دیس کے ہر حصے پر بغیر امتیازِ مذہب وملت برستا رہا ہے۔ میں ایک دفعہ پھر مرحوم شہریار دکن کی یاد میں نذرانۂ عقیدت ومحبّت پیش کرتا ہوں۔

جناب صدر! اس موقع پر جناب والا کی اجازت سے میں دہلی یونی ورسٹی اور نظام اُردو خطبات کے ربط معنوی کے بارے میں چند جملے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ اُردو زبان ہماری قومی یک جہتی تمدنی یک رنگی اور ہزار سالہ اتحاد کی یادگار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان

کی تمام زبانوں میں (جن میں سے بعض نہایت ترقی یافتہ اور نام بر آوردہ ہیں) اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں ہم سب کے جذبات کی دھڑکنیں ہمارے دلوں کی امنگیں، ہماری شادی و غم کی یادیں، ہمارے ماضی کا سوز، ہمارے حال کا ساز اور ہمارے مستقبل کے خوابوں کا راز مضمر ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ یہی زبان ہمارے دیس کے مختلف عناصر کو رشتۂ اتحاد میں منسلک کرتے اور ملک کے سیکولر نظام میں ہر ایک فرد کو اپنا صحیح رول ادا کرنے کے قابل بنا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زبان اس کھڑی بولی کی ایک جانشین ہے جو صدیوں دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اس لیے دہلی اور اردو کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ دہلی یونی ورسٹی ایک ایسا ادارہ ہے جو اپنی وسیع المشربی اور فراخ دلی کے واسطے بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے جس کا دروازہ اگر ایک طرف اعلیٰ سے اعلیٰ سائنٹفک تحقیقات اور انکشافات کے لیے کھلا ہے تو دوسری طرف اس کی آغوش دیس کی ہر ترقی پذیر زبانؔ ادب کی خاطر وا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس یونی ورسٹی کا شعبۂ اُردو کسی اعتبار سے ہندوستان کی کسی یونی ورسٹی سے پیچھے نہیں۔ بلکہ بعض امور میں اکثر سے سبقت لے گیا ہے، اس بنا پر اردو خطبات سے دہلی یونی ورسٹی کا تعلق حق بہ حق دار رسید کا مصداق ہے۔

اس موقع پر ہمیں اعتراف ہے کہ جہاں تک ٹھوس علمی تصانیف کا تعلق ہے ہماری زبان کے گیسو شانے کی منت سے بے نیاز نہیں۔ نظام اردو خطبات کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ علمی موضوعات پر ہر سال ممتاز اہل علم کے مقالات پیش کیے جائیں۔ چناں چہ گذشتہ سال ان

خطبات کا آغاز پروفیسر غلام السیدین صاحب کے خطبات سے ہوا۔ پروفیسر موصوف نے "فکر انسانی کے سفرِ ارتقا" کے عنوان سے جن خیالات کا اظہار کیا، انھوں نے غور و فکر کی تاریک راہوں میں روشنی بکھیر دی ہے۔ موصوف نے اس طولانی سفر کو جس بصیرت افروز انداز میں طے کیا ہے وہ بجا طور پر اس قابل ہے کہ ہمارے دانش وروں سے خراجِ تحسین وصول کرے۔ سیدین صاحب کے بارے میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

جنابِ صدر! ہماری خوش بختی ہے کہ محترم ڈاکٹر تاراچند نے ہماری استدعا پر اس سال کے نظامِ اُردو خطبات کا پیش کرنا منظور فرمالیا ہے۔ آپ کی وسیع نظر، آپ کی عالمانہ فراخ دلی اور فلسفیانہ نکتہ طرازی مسلّم ہے، تاریخ اور خصوصاً تاریخِ ہند میں آپ کا علمی مرتبہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کی شہرۂ آفاق تصنیف "ہندوستانی تہذیب پر اسلامی اثرات" کو اربابِ فن نے ایک عہد آفریں تخلیق تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند نہ صرف ایک ممتاز عالم، ایک نامور مورخ، ایک مسلّم ماہرِ تعلیم، ایک سربرآوردہ دانائے سیاست ہیں بلکہ انسانیت کی ان اعلیٰ اقدار کے قدرشناس اور مشرقی تہذیب کی ان روایات کے علم بردار بھی ہیں جن کے بغیر تعلیم ایک لفظ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہماری عین خوش قسمتی ہے کہ موصوف نے ہماری التجا کو شرف پذیرائی بخشا۔ میں اپنی جانب سے، شعبۂ اُردو کی جانب سے نیز یونی ورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ان کی تشریف آوری پر سراپا سپاس ہوں۔

جناب صدر! اس موقع پر حق پوشی اور غلط کوشی ہوگی کہ اگر جنابِ والا کے احسانات وعنایات کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جب کبھی شعبے کے کسی اہم مسئلے میں خواجہ احمد فاروقی صاحب یا ہم میں سے کسی فرد کو کوئی عقدۂ مشکل پیش آیا تو آپ کے ناخنِ تدبیر نے کمال ہمدردی و دل سوزی سے فوراً اس کو سلجھا دیا جس کے لیے ہم تہِ دل سے جناب کے ممنونِ کرم ہیں۔ آج کی صدارت کے لیے آپ نے اپنی مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست کو شرفِ پذیرائی بخشا اور ہمیں مزید سپاس گزاری کا موقع عطا کیا۔

مے کیسی کس کا دورِ قدح کیسا مے کدہ
ہے سب کرشمہ اک نگہِ دل نواز کا

جناب صدر! جب میں خیال کرتا ہوں کہ ہمارے شعبے کے فاضل اور لائق صدر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی جن کی اَن تھک مساعی نے شعبۂ اُردو کو ایک بلند مقام عطا کیا جن کے دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں نے ہماری زبان کو تحقیق کی پختگی اور ادب کی شگفتگی بخشی، جنھوں نے اپنے شعبے کے ہر رفیق اور اُردو کے ہر متعلم کو ہر ہر قدم پر سہارا دیا اس وقت ہم سے ہزاروں کوس دور ماسکو یونی ورسٹی میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں تو طبیعت کو ان کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے، البتہ اس خیال سے تسکین ہوتی ہے کہ جب وہ مملکت روس میں یہ خبر سنیں گے کہ ان کا بڑے چاؤ سے لگایا ہوا پودا برگ و بار لانے لگا ہے تو ان کی مسرت بے حد اور ان کی خوشی بے پایاں ہوگی۔

ہر جاست نالہ ہمتِ ما حق گذارِ اوست حرفے بہ بالِ مرغِ سحر بستہ ایم ما

دراصل ہمارے شعبے کی سرگرمیاں خواجہ صاحب کے نفَس گیرا، دیدۂ بینا کاوشِ فکر و نظر اور تراوشِ خونِ جگر کی رہینِ منّت ہیں، کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ زندگی کا کوئی مرحلہ خونِ جگر کی تراوش کے بغیر طے نہیں ہوتا۔

جنابِ والا! میں ایک بار پھر آپ کا اور مہمان محترم کا اور دوسرے مہمانانِ گرامی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ازراہِ کرم ہمارے جلسے کو اپنی شرکت سے عزت بخشی۔ اسی کے ساتھ میرا فرض ہے کہ اپنے رفقائے کار اور اپنے شاگردوں کا شکریہ ادا کروں جن کے پُرخلوص تعاون اور اشتراک کے بغیر یہ اجتماع کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

نازک مزاجِ یار و دراز است داستاں
آں ست مصلحت کہ سخن مختصر کنم

میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میری درازنفسی چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق نہ ہو اس لیے میں مہمانِ محترم کے خیر مقدم کے لیے وائس چانسلر صاحب محترم سے درخواست کرتا ہوں۔

ربط است بہ گل زار بہم لالہ و گل را

جناب صدر اور معزز حاضرین!

میرا پہلا فرض تو یہ ہے کہ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی کے اس علم دوست محسن کا شکریہ ادا کروں جس کی فراخ دلی کی بدولت نظام لیکچروں کے سلسلے کی بنیاد قائم ہوئی۔ مجھے نہایت رنج اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے کے بانی ہزاکزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ کا چند روز پیشتر انتقال ہوگیا۔ اس واقعے نے نہ صرف ان کے خاندان اور لواحقین کو بلکہ ان سب لوگوں کو جن کے دلوں میں مغلیہ زمانے کی زرّیں تہذیب اور تمدّن سے دل چسپی ہے، سخت صدمہ پہنچایا۔ مغلیہ سلطنت کی آخری شمع کے بجھ جانے پر سبھی کے دلوں میں غم اور ملال ہے۔ سوائے اس کے کہ ان کے حق میں دعائے خیر کریں اور کچھ چارہ نہیں۔

آج اور کل کے لیکچروں کے بارے میں دو لفظ کہنا چاہتا ہوں ایک تو یہ کہ یہ لیکچر محض اُردو شعبے کے قابل صدر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی کوشش کا نتیجہ ہیں میں کسی

حال میں ان کے لیے تیار نہ تھا، تلبش عربدہ جو و عمرش افسوس کناں۔ بہت بہت حیلے بہانے کیے مگر عزیز دوست فاروقی صاحب نہ ماننے پر نہ مانے۔ آخر ان کے پُرخلوص اصرار اور محبّت بھری ضد کے سامنے سپر ڈالنی پڑی اور اب جو کچھ بُرا بھلا ہے آپ کے سامنے ہے۔

دوسری بات موضوع کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں، میرے لیکچروں کا عنوان ہے "ہندوستانی کلچر کا ارتقا تاریخ کے آئینے میں" لیکن میرا اصل مقصد یہ دکھانا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے تین دوروں میں انفرادیت کا کس طرح نشو و نما ہوا۔ مضمون خشک اور میرا طرزِ بیان روکھا پھیکا ہے کیسے کہوں، "یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب" بس اس عذرِ لنگ کے ساتھ "میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے"

ہندوستانی کلچر کا ارتقا تاریخ کے آئینے میں

پہلا دور

تاریخ داں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علم کی روشنی میں گزرے ہوئے زمانے سے متعلق اہم حقائق کو پیش کرے اور ان اسباب کو دریافت کرنے کی کوشش کرے جو ان کی تہ میں کارفرما رہے ہیں۔ حقائق کے انتخاب میں وہ اس طرف اشارہ تو کرتا ہے کہ کسی چیز کی اہمیّت کا تعین کرنے کے لیے خود اس نے کیا معیار مقرر کیے ہیں۔ مگر ان حقائق کی کیفیت اور قدروں کے متعلق کوئی فیصلہ دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ اس کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ مذہبی، سماجی، معاشی، سیاسی نظاموں اور فلسفیانہ فنی اور ٹکنکی نظریات کے باہمی اثروں کو سمجھنے کی کوشش کرے جو اس کے زیرِ مطالعہ تہذیب کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں اور اگر ممکن ہو تو اس کثرت میں فکری وحدت کے بنیادی اصول دریافت کرے۔

مگر کسی تہذیب کا تجزیہ کرتے یا وضاحت کرتے وقت یہ لازم نہیں کہ وہ اپنی پسند یا ناپسند کا بھی اظہار کرے۔ وہ اگر چاہے اور اس کا ذہن اس طرف

جھکے تو ایسا کر تو سکتا ہے مگر ایسا قابلِ اطمینان پیمانہ ڈھونڈھ نکالنا بہت مشکل ہے جو اتنے پھیلے اور اُلجھے ہوئے انسانی اداروں کی قدروں کے ناپنے میں کام آسکے۔

تاریخ تہذیبوں کے عروج و زوال کی یادداشت ہے۔ ٹوائن. بی (TOYNBEE) نے اپنی کتاب اسٹڈی آف مسٹری (STUDY OF HISTORY) میں ان کی تعداد مقرر کرنے کی کوشش کی ہے اور اکیس[۲۱] تہذیبوں کی نشان دہی کی ہے۔ بعض مفکرین نے ایسا رشتہ یا قانون یا ایک عام اصول معلوم کرنا چاہا ہے جس کی تہذیبوں کے وجود میں آنے پھلنے پھولنے اور پھر تباہ و برباد ہونے نیز ان کے اندر ڈھکے ہوئے معانی و مقاصد کی تشریح و توضیح کی جا سکے۔ لیکن اس کوشش میں انھیں ابھی تک بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر بھی یہ کوشش برابر جاری ہے اور جاری رہنے والی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں بے چین اور بے اطمینان رہتا ہے۔ خاص طور پر ایسے زمانوں میں جب کہ عہدِ حاضر کی طرح مشکلوں اور پریشانیوں کی ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہو اور اس کا یہ یقین کہ گذشتہ تجربات نہ صرف آج کے بلکہ مستقبل کے مسائل کو بھی حل کرنے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں، اسے ان مراحل کے اندر معانی تلاش کرنے پر اکساتا ہے جن سے ہو کر انسانی تاریخ موجودہ عہد تک پہنچتی ہے۔

بہر حال اگر کسی اور مقصد سے نہیں تو کم از کم صرف اس فطری جذبۂ حیرت کی تسکین ہی کی خاطر جہاں سے سارے فکر و فلسفہ کی جڑیں پھوٹتی ہیں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کے تاریخی خد و خال کا جائزہ لیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ کس طرح اس نے زندگی کے مسئلوں کو حل کیا ہے۔

اس تجزیے سے زمانۂ حال کی گتھیوں کے سلجھانے میں مدد ملے یا نہ ملے۔

مگر ہندوستانی تہذیب کے مختلف تاریخی رُویوں پر بحث کرنے سے پیشتر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب ہم ہندوستانی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالنا چاہیے کہ ہم نے ایک ہم ساخت ہم رنگ، ہموار اور کبھی نہ ٹوٹنے والے تسلسل کو ہندوستانی تہذیب کا نام دے دیا ہے۔ دوسرے ملکوں کی تہذیبوں کی طرح ہندوستانی تہذیب میں بھی ہمیشہ تغیرات ہوتے رہے ہیں اور یہاں دوسری سرزمینوں کی تہذیبوں کے دھارے آکر ملتے رہے ہیں جن میں سے کچھ تو مقامی تہذیب میں اس قدر گھل مل گئے کہ ان کی انفرادیت ختم ہوگئی اور کچھ ایسے تھے جنھوں نے اگرچہ ہندوستانی تہذیب کو متاثر کیا اور خود بھی اس سے متاثر ہوئے مگر اپنے آپ کو اس میں ضم کر دینے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ ہر سماج میں اوپر تلے کئی معاشرتی تہیں ہوتی ہیں اور ہر سماجی تہ اپنے اندر خود اپنی خاص تہذیب لیے ہوتی ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو تہذیب دراصل نام ہے ایک آرزو کا، ایک تمنّا کا اور اس کے حصول کے لیے سماج کے بہترین ذہنوں کی جہد و کاوش کا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اصل زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور عمل کا۔ ان دونوں یعنی تصوّر اور عمل کے درمیان ہمیشہ اور ہر جگہ ایک وسیع خلیج حائل رہی ہے۔ سماج کے اعلیٰ ترین طبقوں کی تہذیب چھن چھن کر نیچے آتی رہتی ہے اور اس گرنے میں اور نچلی سطحوں تک پہنچنے میں اس کا خالص رنگ روپ اور کھراپن کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ منزل آجاتی ہے جہاں اُسے پہچاننا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اب وہ اصل کی ایک مسخ شدہ اور مضحکہ خیز شکل بن جاتی ہے اور بس۔

ان خطبات میں جس طبقے کے بارے میں میں کچھ عرض کروں گا وہ ان ہی مخصوص منتخب اور کم تعداد انسانوں کی جماعت ہے جنھوں نے اعلیٰ تہذیبی اقدار پر سوچا اور ان کو اپنے اندر رچا بسا لیا نہ کہ وہ جمِ غفیر جس کی آب تاب تہذیب کے سرچشمے سے دور ہونے کے ساتھ ساتھ ماند پڑتی جاتی ہے۔

ان تمہیدی اشارات کے ساتھ میں اب ہندوستان کی اس تہذیب کا ذکر کروں گا جو اس ملک پر بیرونی دنیا والوں کے عمل دخل سے پہلے پائی جاتی تھی اور پھر اس میں جو عہد بہ عہد تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کا بیان آئے گا۔

تنوع اور رنگا رنگی انسانی فطرت کی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور ہندوستانیوں نے اپنی تاریخ کے ہر دور میں اس رنگا رنگی کا بے پناہ اظہار بھی کیا ہے۔ ماہرِ انسانیات (ANTHROPOLOGISTS) کے خیال کے مطابق نسلی اعتبار سے ہندوستان کے باشندے چھٹے بنیادی اور نوذیلی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لسانی اعتبار سے یہ ایک ہزار سے زیادہ بولیاں بولتے ہیں لیکن اپنی ادبی کاوشوں کے لیے قریب پندرہ زبانیں استعمال کرتے ہیں جنھیں پانچ لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب ہندوستان میں پائے جاتے ہیں اور نہایت دقیق قسم کی وحدانیت سے لے کر بہت ہی بھدی اور نیچی قسم کی توہم پرستی تک ہر عقیدہ اس کے حدود میں مل جاتا ہے۔ فنِ تعمیر، سنگ تراشی، مصوری موسیقی اور رقص جیسے فنون کو ہندوستان نے ان جمالیاتی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے جسے کوئی اور تہذیب آج تک نہ چھو سکی۔ شاعری، ڈرامے

اور فسانہ گوئی میں ہندوستانی ذہانت آج بھی دنیا کے لیے باعثِ حیرت ہے۔ یہ سب چیزیں نوعِ انسانی کا بہترین اور بیش قیمت ورثہ ہیں۔

ہندوستان کا ماضی بڑے عظیم انقلابات کی داستان ہے۔ اس کی وسعت اور کشادگی فراخی اور فارغ البالی کے زمانوں کی یاد آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔ یہ وہ عہد تھے جب کہ اس کی شہرت شش جہات میں پھیلی ہوئی تھی اور علم و حکمت کی پیاس اور یہاں کی دانش گاہوں کی شہرت دنیا کے کونے کونے سے لوگوں کو دور دراز اور زحمت طلب سفر کرنے پر آمادہ کرتی تھی۔ یہاں کے لوگوں کی دولت و ثروت اور صناعی و کاریگری کی کشش سے لالچی اور لوبھی بیوپاری کھنچے چلے آتے تھے اور سونے چاندی کے بدلے یہاں کی حیرت انگیز دست کاری سے بنی چیزیں لے جانے کے خواہاں رہتے تھے۔

اس سرزمین نے عظیم سلطنتوں کا عروج دیکھا، ایسے سماجی اداروں کی تعمیر و تشکیل کی جو مضبوطی اور استحکام میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور ایسے معاشی نظام کو قائم کیا جس نے عوام کو دوسروں سے بے نیاز رہنے اور اپنی ضروریات کو خود پورا کرنے کا موقع دیا اور امیروں کے پاس رفاہِ عام کے کاموں کی خاطر دولت کی وہ فراوانی پیدا کر دی جس کا حاصل اگر ایک طرف فائدہ مند عمارتوں کی تعمیر تھا تو دوسری طرف نمود و نمائش کے جذبے کی تسکین۔ مگر ہر حالت میں ہر فن میں جمالیاتی ذوق کا مظاہرہ تھا۔

کیا اس پرانی تہذیب کا کوئی مقصد یا معراج تھا؟ بات یوں ہے کہ انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک سا حال پر قانع نہیں رہتا جس دن سے اس کا اس زمین پر ورود ہوا ہے اس کے دل میں آگے

اور پیچھے دیکھتے رہنے کی ایک تڑپ موجود رہی ہے۔ وہ مکان اور زمان کی قیدوں سے رہائی چاہتا ہے، اسی لیے اس کی خواہش ہوتی ہے یا زمانے پر قابو حاصل کرے یا اس کو نیست و نابود کر دے۔ وہ سوچتا ہے کہ زمانہ انسان کے باطن میں چھپی ہوئی حقیقت یعنی نوعِ انسانی کے بقا و دوام کی ضد ہے، اسی وجہ سے وہ ہمیشہ بڑھنے اور پھیلنے والے ماضی اور مستقبل پر اپنے اقتدار کو جمانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ ہندو ذہن کائنات کی پیدائش اور موت کے خیالات سے کھیلتا رہا ہے، ان حدود کے اندر یگوں کے آغاز و اختتام کے تصوّرات کے نقشے بناتا رہا ہے اور وہ مستقبل کے دھندھلکے اور ماضی کے بلیون سالہ دوروں اور اس کی منزلوں سے اندازے لگاتا رہا ہے۔ اور اُس زمانے کی افق کے پار جھانک کر موت کے بعد کی زندگی اور آواگون کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس نے زندگی کی مہلت بڑھانے کی فکر نہیں کی۔ بلکہ زندگی کو وقت کی قید سے بلند و بے پروا کرنے ہی کو اپنا مطمحِ نظر سمجھا۔ اس نے موت کو نہ تو زندگی کی انتہا مانا اور نہ یہ ہی قبول کیا کہ زیست کے کاروبار کا ایک بار خاتمہ ہوگا اور پھر ایک ہی بار آخری قیامت کے دن اُٹھنا، اور نہ وہ موت کے بعد دائمی مسرت یا دائمی عذاب کا قائل رہا۔

یہ موت کی حقیقت سے انکار کرنے والا ہندو کلچر دراصل ایک عجیب و غریب ذہن کا عجیب و غریب مظاہرہ تھا، یہ وہ ذہن تھا جو مثالی اور تقسیمی استدلال کا خوگر تھا اور جسے طبقہ بندی تجزیے کا شوق تھا۔ اس کا وجدان محیط کی بہ نسبت مرکز کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اس کی منطق قیاس (DEDUCTION) کی طرف زیادہ، استقرا (INDUCTION) کی طرف کم جھکتی تھی۔

محسوسات سے اتنی رغبت نہیں تھی جتنی معقولات سے۔ اول کو آخر پر، باطن کو ظاہر پر ترجیح دیتا تھا۔ مقدمے کی اہمیت تھی اور نتیجے سے بے علاقگی۔ جس درجہ کُل کا شیدائی تھا اتنا ہی جزو سے لاپروا۔ تفریق کا ماہر تھا ترکیب میں کمزور۔ کثرت میں وحدت کا جویا تھا۔ وہ فرد کو محدود و لامحدود، عالم ذات و عالم کائنات، انا وغیر انا، معروض و موضوع کا ناقابلِ تشریح امتزاج قرار دیتا تھا۔

یہ ذہن علمی تجزیے کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انسان کی حقیقت دوگانگی پر مبنی ہے چونکہ علم عالم اور معلوم کے درمیان ایک تعلق ہے، لہذا اگر دونوں کلیتہً عین حقیقت اور ایک ہوں یا ایک دوسرے سے کلیتہً متضاد ہوں، تو دونوں کے درمیان کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ لہذا ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہوں لیکن ساتھ ہی کچھ نہ کچھ قدرِ مشترک رکھتے ہوں۔ معلوم کا وجود اضافی ہے اور وجود میں زمان و مکان اور سلسلۂ علت و معلول کے اصول مُضمر ہیں۔ اس لیے وجود کے علم کے لیے لازم ہے کہ اس کا عالم ان اصولوں کے حدود سے ماورا ہو۔ اس کا قائم و دائم، مطلق اور علت سے بے نیاز ہونا ضروری ہے۔ اس کی ہستی مطلق ہے اور ادراک سے پرے ہے اور چونکہ وہ ماورائی ہے اس لیے وہ جملہ موجودات کا احاطہ کرتا ہے لیکن خود اس کا احاطہ دوسرے کے لیے محال ہے۔

موجودات کا علم حواس کے وسیلے ہی سے حاصل ہوتا ہے یعنی دونوں عامل اور اس کے معمول کا ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل ہوتا رہتا ہے لیکن اس عمل سے اس وقت تک کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک عالم

اپنے محسوسات کو ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب و ربط نہ دے یعنی جب تک خود اس کی آگہی اس تاریکی کو منور نہ کرے جو اس کے حاصل کیے ہوئے مسلمات پر چھائی رہتی ہے لیکن اس طرح سے حاصل کیے ہوئے علم کا درجہ اضافی (RELETIVE) ہوتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ ایک اور علم ہے، وہ ہے انا کی معرفت و آگاہی، خودی کی خود شناسی یہ ایک بالکل دوسری قسم کا علم ہے کیونکہ انا زمان و مکان اور سلسلۂ علّت و معمول سے بے نیاز ہے یہ اعلیٰ اور ماورائی علم یا عرفان ہے۔

یہ غیر معمولی علم کیسے حاصل ہوتا ہے؟ ظاہر ہے یہ ایک ایسے طریق عمل ہی کے ذریعے حاصل ہوگا جو حصول علم کے معمولی ذرائع سے قطعاً مختلف ہے چونکہ اضافی علم کی بنیاد حواس کے عمل پر موقوف ہے، اس لیے لازمی ہے کہ معرفت کی اساس اس کے برعکس ہونی چاہیے یعنی صرف اس حالت میں جب حواس سرگرم عمل نہ ہوں۔ شعور تو ہو مگر اس کے سامنے معروض نہ ہو تب ہی خودی اپنے آپ کو بلاواسطہ اور بے حجاب دیکھ سکتی ہے۔ یہی وحدت کا وہ تجربہ ہے جس کا اہلِ عرفاں کے یہاں ذکر ملتا ہے۔ یہ تجربہ بیان سے باہر ہے کیونکہ الفاظ وہ مفروضے ہیں جو شعوری نتائج کے اینٹ گارے سے بنتے ہیں اور شعوری وقوف صرف ان ہی مظاہر کے بارے میں معلومات فراہم کرسکتے ہیں۔ جو زمان و مکان کے حدود میں پائے جاتے ہیں۔

قدرتی طور پر یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حواس کی سرگرمیوں کو کس طرح روکا جائے۔ اس کا جواب ہے "یوگ کی مدد سے"۔ اس کی چار منزلیں ہیں ان چہارگانہ منازل کا انجام ذہنی تبدیلیوں

اور بوقلمونیوں کے ختم کرنے پر ہوتا ہے جنھوں نے خودی کی روحانی حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ لیکن جاننا چاہیے کہ یہ تجربہ ذہنی تہی دامنی یا خلا کے مترادف نہیں ہے نہ تو یہ حشیش کش کی مدہوشی کی حالت ہے نہ تحت الشعور کے بیجکا نہ بے تہ فکر کی تشہیر اور نہ کسی ضعیف المزاج انسان کا مریضانہ ظہور۔ یہ وہ جادو نہیں ہے جس کے اثر سے ایک پرندہ میدان میں کھریا سے کھنچے خط پر غش کھا کر گر پڑتا ہے یہ ایک ایجابی کیفیت ہے ذہنی روشنی کی کیفیت جسے "جیوتشام جیوتش" یا نور الانوار کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو ایسی کیفیت ہے جس کے پیچھے مسرتوں کی گھٹائیں امنڈ کر آتی ہیں اور جسے آنند میگھ کا نام دیا گیا ہے۔ اس منزل تک آسانی سے رسائی نہیں ہوتی، یہ راستہ بہت دشوار گزار ہے اور صرف وہی لوگ جو ہمت کے دھنی اور مزاج کے مستقل ہوں، منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے اسے طے کر سکتے ہیں۔ اس شخص کو جو اس مشکل راستے کو طے کرنے کی جرأت کرتا ہے، زبردست ریاض اور سخت مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ اس مجاہدے کے تین جز ہیں جسمانی، ذہنی اور روحانی۔ مقصد یہ ہے کہ بدن کو جسمانی ورزش اور حبسِ دم کے ذریعے مسخر کیا جائے۔ ذہن کو پانچ اخلاقی نیکیوں سے قابو میں رکھا جائے۔ یہ پانچ نیکیاں ہیں عدم تشدد (اہنسا) سچائی، دوسروں کی ملکیت پر بیجا تصرف سے پرہیز (اپریگرہ) شہوانی خواہشات سے بچنا اور حرص و ہوا سے اعراض اور آخری مقصد یہ ہے کہ مراقبے کے ذریعے روح کی سرگرمی کو تیز تر کر دیا جائے۔

وہ فرد جو اس ریاضت و مجاہدے کے تقاضوں کو پورا کر کے نفس پر قابو حاصل کرے وہی ایسی متوازن اور منظم ہستی ہے جس کا طرزِ عمل انسان

کے الہی الاصل ہونے کا ثبوت ہے اور وہی کل انسانوں کی مساوات و برابری کا قائل ہوسکتا ہے۔ جوگ بشسٹ کی یہی تعلیم ہے کہ انسانیت اس عمل کا نام ہے جس کی خصوصیت ازلی اور ابدی ہے جو شخص اس منزل تک پہنچ گیا حقیقت میں اسی نے وہ کمال حاصل کر لیا جس کا حصول فرد کے اختیار میں ہے۔ وہ انسان کامل ہے جو جزویات اور تفریق پسندیوں سے بالاتر ہو جائے اور اپنی خودی کو انسان کے بلند ترین اوصاف سے مزین کرلے۔ پھر کیا انسانِ کامل محض فرار پسند فرد ہے۔ ایک تارک الدنیا سادھو جو جنگل میں ساری دنیا سے الگ رہنے والے راہب کی زندگی بسر کرتا ہو کیا خودی کا عرفان، نورانی وجدان، ابدی سعادت، زندگی میں بے عملی اور دنیا سے بے اعتنائی کا مشورہ دیتے ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں۔" ایش اپنشد" میں آیا ہے

ईशावस्यमिदं सर्वं
यत्किञ्च जगत्यां जगत्।
तेन त्यक्तेन भुञ्जीथा
मा गृधः कस्य स्विद् धनम् ॥१॥
कुर्वन्नेवेह कर्माणि
जिजीविषेत् शतं समाः।
एवं त्वयि नान्यथेतोऽस्ति
न कर्म लिप्यते नरे ॥२॥

(تجھے جاننا چاہیے) اس جہانِ گرداں میں جو شے بھی حرکت میں ہے وہ ذاتِ باری سے محیط ہے۔ اگر تجھے روحانی مسرت کی جستجو ہے تو ترکِ علائق کے ذریعے اس کا لطف حاصل کر جو دوسروں کا حصہ ہے اس پر لالچ کی نظر مت ڈال۔ اس دنیا میں ہمیشہ عمل کرتا ہوا سو سال کی زندگی کی خواہش کر، تیرے

یہی راستہ ہے اور کوئی دوسرا نہیں، اسی راستے سے انسان عمل اور ردِ عمل کے سلسلے کو قطع کر سکتا ہے۔

سری کرشن نے ارجن کو تلقین کی :

कर्मणैव हि संसिद्धि मास्थित जनकादय: ।
लोकसंग्रहमेवापि संपश्यन् कर्तुमर्हसि ॥२-२८॥

راجا جنک اور دوسرے لوگوں نے عمل کے ذریعے انسانِ کامل کا درجہ حاصل کیا۔ اس لیے تجھے انسان کی فلاح اور خیر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عمل میں سرگرم ہونا چاہیے۔

لہٰذا مثالی فرد وہ شخص ہے جو اپنے فرض یا "دھرم" کو نتائج سے بے پروا ہو کر انجام دیتا ہے خواہ وہ سکھ دینے والے ہوں یا دُکھ ؛ خود کرشن نے آخر کار ارجن کو جسے لڑنے میں تامّل اور تردّد تھا فتح اور شکست سے بے تعلق ہو کر محض حق کی خاطر لڑنے کے لیے آمادہ کیا۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ فرد کل انسانوں کی خیر کے مقابلے میں ذاتی مفاد کے تقاضوں سے دست بردار ہو جائے اور عوام کی معقول فلاح و بہبود کے تصوّر کو ذاتی اور جزئی ارادوں پر غالب کر دے۔

اس طرح ہندوستانی فلسفے کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ انسان کی ماہیت دو اجزا پر مشتمل ہے اور وہ ہر جز کے لیے اس کے متناسب مرتبہ متعین کرتا ہے۔ اس فلسفے کا اظہار ہندوستانی تہذیب میں نظر آتا ہے۔ فرد اپنا کمال سماج کو دیتا ہے اور سماج وہ وسیلہ ہے جو فرد کی ان بہترین اور بلند ترین خوبیوں کو جو اس کی ذات میں پنہاں ہیں اپنی مدد سے عمل میں لانے اور پھلنے پھولنے کا موقع دیتا ہے۔ لیکن نہ تو فرد کو اور نہ سماج کو اس بات سے کوئی

دل چسپی ہے کہ اس حصول مقصد میں ان کا جو خاص انفرادی حصہ ہے اس کا اشتہار اور اعلان کرتے پھریں۔ ظاہر ہے ہندوستانی تہذیب کے بیج افراد ہی نے بوئے، اس کے ننھے ننھے پودوں کی پرورش اور نگہداشت میں افراد کا ہی حصہ تھا، ان کی تکمیل کو انھیں کے ذریعے تقویت پہنچی اور انھوں نے ہی اس کی شاخوں کی تربیت کی۔ اس طرح افراد کی کوشش سے یہ تہذیب، دنیا کی تہذیبوں کے پھیلے ہوئے جنگل میں ایک تناور اور عظیم درخت کی شکل میں نمودار ہوئی۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ افراد جنھوں نے یہ تحقیقی کارنامے انجام دیے، ہمارے لیے سوائے ناموں کے کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور بعض اوقات ان کے نام بھی معلوم نہیں۔

یہ امر کہ مقدس مذہبی کتابوں کے مصنفین کی شخصیت پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ وردھان مہاویر اور گوتم بدھ جو جین اور بدھ مذاہب کے بانی تھے، ان کی حیثیت افسانوں سے کچھ زیادہ نہیں۔ اس کی توجیہ ان کی قدامت سے کی جا سکتی ہے لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ وہ مذہبی مفکر جو نسبتاً زیادہ قریبی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جیسے شنکر، رامانج، مدھو، ولبھ وغیرہ۔ ان کی زندگی کی تفصیلات بھی تقریباً کلیتہً معدوم ہیں۔ بلند ادبی شخصیتوں کا مثلاً کالی داس، بھر بھوتی، بھاروی، ماگھ، ڈنڈی کا اور ان فسانہ نویسوں کا جنھوں نے کتھا سرت ساگر، برہت کتھا منجری، پنچ تنتر مرتب کیں، یہی حال ہے۔ یہی مسئلہ ان مصنفین کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جنھوں نے فلسفہ اور سائنس کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔ اس کے باوجود یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ ان میں سے ہر مفکر، ہر شاعر اور ہر فن کار کی تخلیقات اپنی اپنی جگہ منفرد ہیں اور بعد میں آنے والی نسلوں نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان شخصوں کے

ذہنوں کی پیداوار کا باقی رہ جانا لیکن ان کی زندگی کے تذکرے کا فراموشی میں گم ہو جانا ہندوستانی تہذیب کی ایک نمایاں امتیازی خصوصیت ہے۔ علمی میدان میں مشہور علماء کی سوانح حیات اور تاریخ کا رُخ پلٹنے والے کرداروں کے کارناموں کی داستان جنھوں نے لاکھوں افراد کی زندگی کو متاثر کیا' دونوں ہی اسی بے اعتنائی کا شکار ہوئی ہیں جو زندگی کے ناپائدار اور گریزاں مظاہر کے ساتھ برتی گئی ہے۔ بہر حال وہ جس کا دامن زمانے کے ساتھ بندھا ہوا ہے اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ وہ جو زمانے کے حدود سے پرے ہے۔ اس بنا پر ہندوؤں کی تاریخ جو پرانوں میں درج ہے کائنات کی تخلیق (سرشٹی) اور فنا (پرلے) کی داستان ہے۔ لیکن اس ابتدا اور انتہا کی تکرار میں افراد کا عمل سمندر کی لہروں کے جھاگوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ موضوع قدیم ہندوستانی تہذیب کے سمجھنے میں کلیدی مقام رکھتا ہے۔ اس کی رو سے فرد کے اندر جو کچھ حقیقی ہے وہی اہم ہے اور جو کچھ محض تجرباتی یعنی زمانی اور مکانی ہے اس کا درجہ ثانوی ہے۔ لہٰذا ہندو مذہب کے تمام فرقوں اور فلسفہ کے جملہ دبستانِ فکر میں ایک ہی موضوع غالب رہا ہے۔ جس مسئلے کے حل پر ان سب کی توجہ ہمیشہ سے مبذول رہی ہے وہ اس حقیقت کی تلاش ہے جو واحد، ہمہ گیر، غیر مشروط مطلق اور حقیقی ہے اور جو کثیر، جزئی، مشروط، اضافی اور غیر حقیقی سے مختلف ہے۔ اگرچہ فرقوں کے طرزِ فکر متعدد ہیں، مسئلے کے حل کرنے کی تفصیلات ایک دوسرے سے جدا ہیں، ان کا نفسیاتی تجزیہ اور ان کے علمیاتی اور وجودیاتی نظام بھی لاتعداد ہیں لیکن ہر ایک اپنے اپنے طور پر انسانی وجود کی غرض و غایت اور اس کے حصول کے طریق کار کی دریافت کے لیے کوشاں رہا ہے

مگر مذہب اور فلسفے کا مطالعہ محض ذہنی جستجو کی تسکین کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے کہ ہماری زندگی کے معمولی روزمرّہ تصوّر میں تبدیلی ہو۔ اس تبدیلی کا مقصد جزا اور سزا کی دنیا میں گرفتار رہنے والے انسان کو تقدیس کے عالم تک پہنچانا ہے۔

تہذیب کے دوسرے شعبوں میں بھی اسی طرح کے بنیادی تصوّرات کی کارفرمائی تھی یعنی کثرت میں وحدت کی تلاش اور نام اور روپ کے تنوع میں حقیقت اور ماہیت کی جستجو۔ مختلف فنون کے اندر ان اصولوں کی ایسی ہی اچھی مثالیں ملتی ہیں جیسی تہذیب کے دوسرے پہلوؤں میں۔ ہندوستان کی فنی تخلیقات کا مقصد اس حقیقت کو بے نقاب کرنا تھا جس پر رویوں کے مظاہر نے پردے ڈال رکھے ہیں۔ یہ مقصد توجہ کی شدید یک سوئی سے ہی پورا ہوسکتا ہے۔ اس کی مثال اس کاریگر کے وطیرے میں ملتی ہے جس کا قصہ بھگوت پران میں یوں لکھا ہے۔ ایک کاریگر تیر بنا رہا تھا لیکن اپنے کام میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اسے اس کا پتہ نہ چلا کہ شاہی جلوس جو بڑے دھوم دھڑکے سے نکل رہا تھا کب اس کے سامنے سے گزر گیا۔ "شکرنیتی سار" کے مطابق فن کار کو دیوتاؤں کی مشابہت کا علم صرف ذہنی یک سوئی اور توجہ سے حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے لیے وجدانی نظر یقیناً بہترین اور سچا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس لیے صرف باطنی نگاہ کی بنیاد پر ہی نہ کہ طبیعی آنکھ سے نظر آنے والی چیزوں کی بنیاد پر فن کار کو کام کرنا چاہیے۔" ظاہر ہے کہ اس قسم کے فن کار کی پرورش اور تربیت ایک ایسے ہی سماجی نظام میں ممکن ہے جو ساکن اور خود کفیل ہو۔ جہاں آپس میں کسی قسم کا مقابلہ نہ ہو اور جس کے عناصر میں ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش نہ ہو۔ تمام ہندو یادگاریں اور بے شمار سنگ تراشی اور نقاشی کے کارنامے جن سے ان کی آرائش کی گئی ہے خاندانی کاریگروں کی چابک دستی کے رہینِ منت تھے اور یہ کاری گر ایسی

شرکتوں کے ارکان تھے جہاں فن اور اس کا کمال باپ سے بیٹے کو ورثے میں ملتا تھا۔ ایسے فن کار جو اس نظام سے علیحدہ ہو کر محض اپنی انفرادیت کے تقاضوں کے پورا کرنے کے لیے فن کاری کریں، ہند میں کم ہی تھے۔

آیئے ان فن کاروں کے کچھ کمالات پر نظر ڈالیں جن کا نام بھی زمانے کو یاد نہیں۔ فنونِ لطیفہ میں فنِ تعمیر کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وہ عظیم اور اہم فن ہے جس پر دوسرے فنون کا دار و مدار ہے۔ ہند کی قدیم ترین یادگاریں مذہبی عقیدت کے جذبے کے تحت تعمیر کی گئیں۔ اشوک کے عہدِ حکومت میں تیسری صدی قبل مسیح کے اندر مقدس مقامات اور خانقاہوں کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ بڑا تعجب یہ ہے کہ کوہستانی علاقوں میں پہاڑوں کو کاٹ کر ان یادگاروں کو بنایا گیا۔ ان میں سب سے مشہور بدھ اور ہندو عبادت گاہیں تھیں جو غاروں میں بنی ہوئی ہیں۔ مثلاً اجنتا اور ایلورا کے رہائشی کمرے اور پوجا پاٹ کے مکان جو ہندوستان کے مغربی ساحلوں پر سہیادری کے پہاڑوں پر واقع ہیں۔ نہیں معلوم ان مقامات کے انتخاب میں فطری ہوش و وجدان اور عقل میں سے کون عامل کارفرما تھا یا ان کا انتخاب تینوں کا مرہونِ منت تھا۔ پھر بھی اس انتخاب کی اہمیت میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہونا چاہیے پہاڑ فطرت کی اصلی اور اولین حالت کا مظہر ہیں۔ یہ ٹھوس بے ڈول تودے ایک عظیم بے پروا دیو ہیکل مجسمے کی مانند زمین پر ٹانگیں پھیلائے کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حرکت ہے نہ تبدیلی۔ انسان کا ذہن ان پہاڑوں کے سینے میں شگاف کر کے اندر گھس جاتا ہے اور اس کے غاروں کو رہائشی مسکن اور مندروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں حیرت انگیز اشکال کی دنیا بس جاتی ہے، دیوتا اور فرشتے آباد ہوتے ہیں اور انسان، جانور اور پودے بکثرت

بکھر جاتے ہیں۔ اس عمل سے مادّی دنیا کے اندر فکر کی دنیا گھر کر لیتی ہے۔

اشوک کے بعد صدیاں گزر جاتی ہیں اور بدھ مت ہندو تہذیب میں جذب ہو جاتا ہے۔ مہایان کی جگہ شوا اور وشنو کی پوجا لے لیتی ہے اسٹوپوں اور کھڑی اور بیٹھی بدھ کی مورتوں کی جگہ نئے دیوتاؤں کے نشان اور بُت آجاتے ہیں ان کے پرستار ان خیالات کے تحت نئی تعمیر کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں جو ان کے لیے مناسب ہوں۔ اس کے نتیجے میں علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے مندروں کا رواج ہوتا ہے۔ بدھوں کے ایوان کا نقشہ مندر کی بنیادی منزل کی تعمیر میں اختیار کیا جاتا ہے اور بلند پہاڑ اور اس کے خط و خال کی تمثیل کو شکھر اور دمان کے روپ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

ہندو مندر جس نے بودھوں کے چیت کی جگہ لی، ایک چھوٹا سا اندھیرا مربع کمرہ ہوتا ہے۔ اس کا دھندلکا جس میں چیزوں کی تمیز مشکل ہے، موٹی موٹی دیواروں میں محصور ہوتا ہے اور اس کی چھت سے اٹھے ہوئے شکھر آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ اس کے وسط میں مورتی نصب کی جاتی ہے اور ایک چکردار راہداری کمرے کے چاروں طرف واقع ہوتی ہے۔ اس کمرے کا اندرونی حصہ مورتی کے علاوہ خالی اور تاریک ہوتا ہے اور اس میں مشکل سے ایک پرستار کے لائق جگہ ہوتی ہے لیکن بیرونی حصہ بے شمار سماوی اور ارضی شکلوں سے معمور ہوتا ہے۔ ان کی نمائش دیواروں، دروازوں، ستونوں پر ہوتی ہے اور اس منارے پر بھی جو سیدھا یا کج منزل بہ منزل اٹھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی دیواروں پر کوئی خالی جگہ نہیں چھوڑی جاتی۔ پوری کائنات اس کی بیرونی سطح پر نقوش کی شکل میں نظر آتی ہے۔

اس مقدس عبادت گاہ کے محترم حریم کے اندر انسان حقیقت کے

سامنے آتا ہے جہاں اس کے ذہن کی یک سوئی کو محسوسات درہم برہم نہیں
کرتے۔ اس کے حواس بھی اس وقت ساکن ہو جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح
جیسے کرشن کے مکاشفے کے وقت ارجن کا حال ہوا تھا لیکن باہر آکر وہ
کثیر المناظر کائنات کے مہیب چہرے کو دیکھتا ہے۔ اس طرح ایک ہی ساتھ
جیسے ہی پرستار مندر میں داخل ہوتا ہے اسے خلا اور ملا دونوں کا تجربہ
ہونے لگتا ہے اور یہاں روح اور کائنات کی ثنویت کی مثال آنکھوں
کے سامنے آجاتی ہے۔

دوسرے فنون میں بھی اسی جمالیاتی شعور کا اظہار ہے۔ خواہ پتھروں کی
مدد سے بت تراشے گئے ہوں یا خطوط اور رنگ کے ذریعے سے دیواروں
اور کاغذوں پر تصویر کے پیکر بنائے گئے ہوں۔ سب کی زبان سے ایک
ہی بات نکلتی ہے، ایک ہی مفہوم کا اظہار ہوتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کہا کرتا تھا
"نقاشی میں مجھے عرفانِ الٰہی کی مخصوص انداز سے آگہی ہوتی ہے۔" اس تصور کے
حساب سے نقاش جس میں تخلیق کا مادّہ ہے محض فطرت کا نقال نہیں ہوتا، وہ
دنیا کی تصویر کشی مالک کی لیلا سمجھ کر سپید و سیاہ کی سیر کرکے اس کے قبلہ گاہ کی نقاشی کرتا ہوئے
اس طرح خوابوں کی ایک دنیا کو وجود میں لاتا ہے جس کی تکمیل جذبات کی تسکین کا وسیلہ ہوتی ہے۔
سنگ تراشی کے پیمانے اور تناسبات جمالیاتی قوانین کی تشکیل کرتے ہیں جن
سے نہ صرف آنکھیں ہی لطف اندوز ہوتی ہیں، روح بھی طمانیت حاصل کرتی
ہے۔ نقاش کے رنگ فطرت کی صنعتوں کے رموز کا اعلان کرتے ہیں۔ سیاہ
اور نیلا رنگ تمس اور مایا کا مظہر ہے جو کائنات کی مادی اساس ہے۔ سرخ
رنگ رجس توانائی جذبات اور فعالیت کا نشان دیتا ہے اور سفید رنگ ستو
یعنی نیکی اور خواہش کمال کا۔

قدیم ہندوستان میں موسیقی اور رقاصی پوجا کی رسوم کے ضروری اجزا تھے ہندوستانی تہذیب میں دونوں کا بڑا بلند مقام تھا۔ ہندو دیو مالا نے کائنات کی تخلیق کو بھی شو کے ناچ سے منتسب کیا ہے۔ ہندوؤں کا یقین ہے، کرشن (جنھیں خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے) کی جادو بھری بانسری نے برندابن کے گوالوں اور گوپیوں کو ناچنے کے انداز اور گانے کے اُتار چڑھاؤ سکھائے اور جب عہدِ نوح کی سی بارش سے برج کی عافیت خطرے میں پڑ گئی تو ان کے رقص نے گوبردھن کی پہاڑی کو اپنی انگلی پر اُٹھا کر مقدس بن کو تباہی سے بچا لیا۔ مہابھارت کے ہیرو ارجن نے اپنے جلاوطنی کے ایام رقاصی کی تعلیم دینے میں گزارے۔ رقص خواہ مندروں میں ہے، خواہ موسمی تبدیلیوں کے زمانے میں، خواہ تیوہاروں اور شادی بیاہ کے موقع پر اس کا مظاہرہ رام لیلا میں ہو، بھارت ناٹیم یا کتھا کلی میں۔ یہ سب دراصل خودسپردگی کی شقیں ہیں۔ ان کے اندر انسان خود کو گم کر دیتا ہے اور اس آہنگ اور نظام کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے جس پر کائنات کا مدار ہے۔

موسیقی بھی زندگی کے اندر اتنا ہی اہم کردار ادا کرتی ہے جتنا رقاصی۔ وید کے منتر نغموں پر مشتمل ہیں۔ راگوں سے نہ صرف انسانی جذبات کا بلکہ اس کے متناسب فطری شؤن کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ کیرتن یا اجتماعی موسیقی ہی بھگتی ہے جو مذہب عشق کے مترادف ہے۔ بنگال میں اس آفاقی مذہب کے ایک بڑے معلّم چیتنیہ نے سولھویں صدی میں تعلیم دی کہ کیرتن کے ذریعے گانے اور ناچنے کے وسیلے سے فرد خود کو ذاتِ خداوندی میں جذب کر کے عرفانِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ میرا بائی جو میواڑ کے راجہ کی رانی تھی راج محل کے عیش و آرام کو چھوڑ بندرابن کے مندروں میں کرشن کی مورتی کے سامنے

ناچنے میں مگن ہوگئی۔ آج بھی اُس کے رسیلے گیت ہندوستان کے شہروں اور گاؤں میں گائے جاتے ہیں۔ رابندرناتھ ٹیگور بھی کوئی معمولی موسیقار نہیں تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں گانے کا ایک نیا انداز ایجاد کیا۔ گاندھی جی کا سورج ڈوبتے سندھیا کی پرارتھنا میں روزانہ کیرتن لوگوں کی کشش کا ایک قوی ذریعہ اور اُن کی مقبولیت کا ایک نمایاں سبب تھا۔ رقص و سرود کی تہ میں جو جذبہ کارفرما رہا ہے وہ دائمی طور پر انسان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ محض فطرت کا جز نہیں ہے جو اس کے اشاروں پر چلتا رہے بلکہ وہ ایک ایسے اصول کا حامل اور ایک ایسی خود آگاہی کا ظہور ہے جو اسے فطرت سے بلند کرتی ہے اور جو خبر دیتی ہے کہ وہ اس جہان کا جسے وہ خود تعمیر کرتا ہے، مالک اور آقا ہے۔ اسی آگہی نے ہندوستان کے معاشرتی نظام کو تعمیر کیا تھا اور اس کا مقصد انسان کے روحانی اور دنیوی تقاضوں کو پورا کرنا تھا۔

ہندو تہذیب کی یہ عظیم الشان کوشش تھی جس کا مقصد اپنے معاشرتی نظام کو ایک عالمی نظریے پر قائم کرنا اور سماجی تقسیم کو عملوں کی تفریق میں ڈھالنا تھا۔ مشہور مقنن منو کی تعلیم ہے کہ برہمن کی عظمت اس کے مقدس علم پر، چھتری کی اس کی شجاعت پر اور ویش کی اس کی دولت پر مبنی ہے مگر شودر کی خصوصیت صرف اس کی عمر سے ہے۔ برہمن وہ ہے جو اپنی زندگی مطالعہ، تعلیم اور پرستش کے لیے وقف کردے۔ چھتری جنگ اور دفاع اور حکومت کے لیے مخصوص ہے۔ ویش تجارتی کاروبار، زراعت اور مویشیوں کی پرورش کے لیے اور شودر خدمت کے لیے۔

کم و بیش دو ہزار سال تک —— اور اس عرصے کا چینی اور مصری تہذیب کے دوروں کے ساتھ موازنہ کیا جا سکتا ہے —— یہ صورتِ حال

اپنی جگہ قائم رہی۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا جب تاریخ نے اسے ختم کر دیا۔ اس نادر نظام کی لطافت اور نزاکت عجیب و غریب تھی۔ لیکن وہ اپنے پیرودں سے ایسے اندازِ زندگی کا متقاضی تھا جس میں بہت زیادہ بلند فکر اور شدید تنظیم و ضبط درکار تھا۔ مگر چونکہ اس کے پاس علم اور اطلاع رسانی کے جو بھی ذرائع تھے یا حمل و نقل کے وسیلے تھے، بے حد سادہ اور پست تھے ان کے پیشِ نظر ایک نہایت ہی قلیل تعداد اقلیت ہی اس تہذیب کی حامل ہو سکتی تھی۔ اس تہذیب میں اونچے طبقوں اور عوام کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے جیسے مالک اور بندوں میں، متکبر امیروں اور مسکین غریبوں میں یا لادنے اور لدنے والوں میں ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کی نوعیت کسی طرح بھی اس سے بہتر نہ تھی جو باشندگان ایتھنز کی تفریق میں تھی۔ ایک طرف وہ طبقہ تھا جس نے شان دار تہذیب و تمدن کی ایجاد میں نمایاں حصّہ لیا اور دوسری طرف وہ غلام تھے جو ان کے نان و نفقے کے ذمّے دار تھے۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ روحانیت اور عقلیت کو ترجیح دیتا تھا اور دولت اور خود غرضی کی پست ذہنیت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طبقہ ویش اور شودر کی محنت و عرق ریزی کے بل پر ہی زندگی بسر کرتا تھا۔ بالائی طبقے کے لوگوں نے نیچے طبقوں کو اپنی سطح پر لانے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ انھیں ان بلند نصب العینوں کے مطابق جو اپنے لیے وضع کیے تھے زندگی بسر کرنے کے حقوق سے محروم رکھا۔ مگر اس بے پروائی نے انتقام لیے بغیر نہ چھوڑا۔ نچلا طبقہ سماج کی عمارت کے لیے ریت کی بنیاد ثابت ہوا۔ شودروں کی ہستی میں الوہیت کے جاودانی عنصر کا انکار جان لیوا نکلا۔

اونچا طبقہ اس کشمکش میں جس کا اسے سامنا کرنا پڑا ہلاکت کے کنارے تک پہنچ گیا۔

سوال یہ ہے کہ ہندوستان جس نے ایسی شاندار تہذیب کو ترقی دی بالآخر کیوں ناکام رہا۔ ایسا کیوں ہوا کہ جب ترکوں اور تاتاریوں کا ہجوم جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا وسط ایشیا سے شمال مغربی ہندوستان کے قدرتی محافظوں ندیوں اور پہاڑوں کو عبور کر کے میدانوں میں آنا شروع ہوا تو گو ہندوستانی بڑی بہادری بلکہ بے باکی سے لڑے، پھر بھی حملہ آوروں کو روک نہ سکے۔ غزنوی ترک تازوں کو اور ان کے بعد غور کی چھوٹی سی ریاست کے غارت گروں کو ملک کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک روند ڈالنے میں کوئی دشواری نہیں آئی۔ مورّخوں نے اس عجیب سماجی انقلاب کی وجہیں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے ملکوں میں ان جیسے واقعات کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً دولت مند اور مہذّب مصریوں نے ہکسوس (HYKVES) کے مقابلے میں (جو فلسطین کے چرواہے بادشاہ تھے) شکست کھائی۔ تمدّن سے ناآشنا مگر جفاکش مقدونیوں کے مقابلے میں اہل ایتھنز نے سپر ڈال دی۔ یونان نے روم سے اور روم نے شمال وسطی یورپ کے بربر حملہ آوروں سے ہار مانی۔ ریگستانِ عرب کے صحرا نشینوں نے ایران کی ساسانی شہنشاہیت کو ختم کر دیا اور عثمان ترکوں نے بازنطین کا غرور خاک میں ملا دیا۔ قدیم چین جو غیر معمولی طور پر مہذّب تھا منگول حملہ آوروں کے طوفان کو روکنے میں ناکام رہا۔ یونان کی مثال بہت ضروری اور سبق آموز ہے۔ یونانی اہل روم کے مقابلے میں ذہنی تربیت علم و حکمت، سائنس اور نظری اور علمی سیاست میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے

تاہم روم کے لشکر نے ایسی تندی اور تیزی کے ساتھ حملے کیے کہ یونان کی فوج کو ان کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ سوال یہ ہے کہ کیا فوجی تنظیم میں تفوق و برتری نے یونان کی برتر تہذیب و ثقافت کو شکست دی؟

اس کا جواب تاریخ داں یہ دیتے ہیں کہ اس ناکامی کا باعث اتنی یونانیوں کی فوجی تنظیم کی کمتری نہیں تھی جس قدر ان کی سماجی تنظیم کی پستی و کمزوری۔ یونان کی شہری ریاستیں ترقی اور تہذیب میں ضرور پیش پیش تھیں لیکن ساتھ ہی آپس میں حد سے زیادہ غیر متحد تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف تھیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بالآخر مفتوح یونانی ہی ذہنی میدان میں فاتحوں پر غالب آ گئے۔

ہندوستان کی تاریخ میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ملتی ہے۔ بارھویں صدی میں جب کہ فاتحوں کے سامنے ہندوستان کی راہیں کھلنے لگیں تو ملک نے مکمل انتشار اور نراج کا منظر پیش کیا۔ راجے اور سردار ایک دوسرے کے ساتھ گھریلو جنگوں میں مصروف تھے۔ ہر راجا اپنے ہمسائے کو اپنا فطری دشمن سمجھتا تھا اور اپنے ہمسائے کے ہمسائے کو اپنا ممکن دوست۔ وہ قوت کے غرور میں ایک دوسرے کے مقابلے میں ڈٹ جاتے تھے۔ ان کے دل رشک و حسد کے جنون میں چور تھے لیکن سر اونچے حوصلوں سے بھرے تھے۔ ہر راجا کی انتہائی خواہش تھی کہ شہنشاہ "چھتر پتی" کا بلند منصب حاصل کرے اور اس مقصد کی کامیابی کے لیے نہ صرف حکومت کے خزانے کو بلکہ اپنے سپاہیوں اور سواروں کے خون کو ختم نہ ہونے والی عداوتوں میں صرف کر دیتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا "یا تخت یا تختہ"۔ وہ یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے سورماؤں کی طرح تھے جو کبھی تو نیزہ بازی کے خوں ریز مقابلوں میں مشغول

ہوتے تھے، کبھی اپنے حریفوں کے قلعوں کا محاصرہ کرتے تھے اور کبھی میدانِ جنگ میں شمشیر زنی کے جوہر دکھاتے تھے۔ مگر اپنے دشمن کا کبھی مل کر مقابلہ نہ کرسکے۔ دشمن ملک کی حدوں پر منڈلاتا رہتا تھا اور حملے کی دھمکی دیتا تھا لیکن لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے انھیں اتنا بھی شعور نہیں تھا کہ کون ان کا اپنا ہے اور کون پرایا۔

ہندوستانی سماج کی زندگی میں ایک عجیب دوگانگت ملتی ہے ایک جانب جنگ وجدل سے علاقہ، جذبوں کا ہیجان، عیش وعشرت کا عشق و حوصلوں کا اوج تھا تو دوسری جانب حق وصداقت کی تلاش، نفس کی پاکی، وجدان کی رفعت اور زندگی کی اعلیٰ اور دوامی قدروں کی کشش۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوئی اس منطق کا نتیجہ تھی جس نے علم ومعرفت کی دو صفتوں "پرا" (آسمانی) اور "اپرا" (دنیوی) کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج پیدا کردی تھی۔ وجود کو دو قسموں میں بانٹ دیا تھا ایک غیر مشروط اور حقیقی اور دوسرا مشروط اور شہودی۔ سماج کے بھی دو طبقے تھے "دوج" اور "شودر" (جن میں ویشیہ بھی شامل تھے)۔ اسی طرح ریاست کے بھی دو حصّے تھے: غیر ذمّے دار حاکم (راجن) اور غیر سیاسی محکوم (پرجا)۔ حتیٰ کہ ذہنی مساعی کے میدان میں بھی دو جماعتوں کے درمیان فرق تھا ایک جانب وہ راہ رو تھے جنھوں نے عرفان کی جانب رہ نمائی کرنے والا راستہ اختیار کرلیا تھا اور دوسری جانب عوام کی وہ کثیر تعداد جو اس روحانی سفر سے بچھڑ گئی اور مادّی زندگی کی دلدل میں پھنس کر رہ گئی۔

ہندوؤں کا معاشرتی نظام ایک ہی وقت میں ضرورت سے زیادہ لچکدار اور سخت تھا۔ خاندان اور ذات برادری کے بندھنوں میں جکڑے فرد کو اپنی

خودی کے اجاگر کرنے کا بہت کم موقع تھا۔ لیکن زندگی کی اعلیٰ اقدار کی جستجو میں اسے پوری آزادی تھی۔ ذات برادری کے تفرقوں نے انسانوں کو تنگ اور اٹوٹ جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ذات کے افراد نہ دوسری ذات میں داخل ہو سکتے تھے اور نہ دوسری ذاتوں کے ساتھ برادرانہ یگانگت کا احساس رکھتے تھے۔ برہمن یعنی صاحب علم و حکمت طبقے نے جو علم و عرفان اور تہذیب و تمدّن کا امین تھا دوسری ذاتوں کی ذہنی روشنی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ پائین طبقے نے قومی مصیبتوں اور امتحانوں میں اونچے با اختیار طبقے کا ساتھ نہیں دیا۔

چھتری یا نظامی طبقہ تن تنہا سماج کا محافظ تھا اسے ان لوگوں سے جن کی وہ جان پر کھیل کر حفاظت کرتا تھا بہت کم مدد ملتی تھی۔ چھتری کو دراصل قرونِ وسطیٰ کا نائٹ (KNIGHT) سمجھیے جس کی دنیا جنگ، شراب، عورت اور نغمہ تک محدود تھی۔ رہے مال دولت پیدا کرنے والے اور محنت کش مزدور تو وہ دوسروں کے لیے محنت کرتے تھے لیکن تحصیلِ علم اور سپاہ گری کے اعلیٰ پیشوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ وہ اس احساس سے قطعاً محروم تھے کہ سماج میں ان کا بھی "کچھ" درجہ ہے۔ وہ قربانی کے جذبے کی اس دھڑکن سے ناواقف تھے جو انسانوں کے دلوں کو گرما کر محبت و اتحاد کی زنجیروں میں باندھ دیتی ہے اور جس کے اثر سے سماجی ہیولے کی رفتار میں استقلال، وزن، متانت اور ہم آہنگی آجاتی ہے۔

دوسرا اور تیسرا دور

قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی طرح ہندو معاشرہ بھی زرعی جاگیرداری پر مبنی تھا۔ اس جاگیرداری نے یورپ میں تین طبقے پیدا کیے۔ مذہبی پیشواؤں اور راہبوں کا طبقہ (جس کی اہم خصوصیت مذہبی عبادت اور ضبطِ نفس تھی) فوجی یا جنگی طبقہ جس کا کام لڑنا بھڑنا تھا اور مزدور کاشتکار طبقہ جو اِن دونوں طبقوں کے لیے محنت کرتا تھا اور پسینہ بہاتا تھا۔ باوجود اپنی خامیوں کے اس جاگیرداری نظام نے کئی قابلِ قدر چیزیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ گوتھک فنِ تعمیر کے گرجے، ڈانٹے کی ڈوائن کمیڈی (طربیہ ربانی) سینٹ ٹامس اکویناس کی "سُمّا تھیولوجی کا" (حکمتِ الٰہی کا مجموعہ)، فرانسسکن اور ڈومی نیکن راہبوں کے نظام اور یونی ورسٹیاں۔ لیکن ہندو اور یوروپی دونوں نظام یکساں کمزور اور ضعیف ثابت ہوئے۔ یورپ کی ملتوں نے جاگیرداری کا دشمن اپنے اندر سے پیدا کیا اس کے برعکس ہندوستان کی قسمت میں اجانب کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی ذلت لکھی تھی۔

پہلے ترکوں اور تاتاریوں کے جُھنڈ وسط ایشیا سے آئے جو اپنے ساتھ اسلام کا مذہب لائے۔ لیکن ان کے مذہب میں خالص عربیت نہیں تھی اور ایرانی ذہن کی آمیزش ہو چکی تھی۔ یہ جنگجو شہ سوار پہلے تو شمالی ہندوستان کے میدانوں پر حملہ آور ہوئے اور پھر انھوں نے دکن کی فتح کے لیے اپنا راستہ پیدا کر لیا۔ لیکن وہ ایسے شہروں اور باموقع مقامات پر قابض ہوئے جہاں سے وہ ہندو زمینداروں، مقدموں اور چودھریوں کو جو دیہات پر بُری طرح مسلّط تھے، مرعوب کر سکیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہندو سماج اور ان کی تہذیب اور سیاست کو سخت صدمہ پہنچا۔ ہندو سامراج ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے محو ہو گیا۔ ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے جو ایک جانب فکری اور مدنی سرگرمیوں کے امین تھے اور دوسری جانب قومی آزادی اور امن و قانون کے محافظ، حملہ آوروں کے سامنے بے اختیار ہو گئے اور ہندوؤں کا سماجی نظام بے سَرا ہو کر رہ گیا۔

وسط ایشیا سے جو مسلمان ہندوستان آئے وہ مدینہ، دمشق اور بغداد کے عربوں نیز شیراز، اصفہان اور رے کے ایرانیوں سے قطعاً مختلف تھے۔ وہ ترکستان کے باشندے تھے جو اسلامی قلم رو کے انتہائی سرے پر آباد تھے۔ وہ اس وقت ہندوستان میں پہنچے جب کہ خود عالمِ اسلامی شدید قسم کے سیاسی اور مذہبی بحران سے دوچار تھا۔ سیاست میں خلافتِ بغداد کا اقتدار قیامت خیز زوال کا شکار تھا۔ خود مختار سلطنتوں کی بنیادیں پڑ رہی تھیں اور خلافت کا نظام تتر بتر ہو رہا تھا۔ مذہبی میدان میں اہل ظاہر اور رسم پرست طبقے کا مقابلہ صوفیوں سے تھا جو اہلِ تقلید کے برخلاف

ظواہر کی پابندی سے آزاد اور شریعت کے منصوبوں سے بے پروا تھے۔ اس زمانے کی شاعری اسی اختلاف کو منعکس کرتی ہے۔ حافظ کہتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

صوفی کو زاہدوں سے اس طرح الگ کرتے ہیں:

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

عطّار اس فرق کو یوں بتاتے ہیں:

دلِ عاشق خراب اندر خراب است
دلِ زاہد غرور اندر غرور است
دلِ زاہد ہمیشہ در خیال است
دلِ عاشق حضور اندر حضور است

اردو زبان جو شوخی میں دنیا کی زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے اپنے ایک شاعر کی زبان سے پوچھتی ہے۔

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو

سنائی نے صاف کہہ دیا ہے:

زباد فقہ و باد فقر دیں را ہیچ نکشاید
میان در بند کاری را کہ ایں رنگ است و آں آدا

یہ اہلِ معرفت پہلے طبقے کو اس بنا پر ملامت کرتے تھے کہ اس نے خالق اور مخلوق کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج پیدا کر دی ہے اور اس طرح

عملی طور پر عقیدۂ وحدت کا انکار کر دیا ہے۔ انھوں نے وحدانیت یا ہندوستانی الاصل وحدت الوجود کا عقیدہ اختیار کر کے ثنویت کے عقیدے کا مقابلہ کیا۔ دو سو سال تک یہ قضیہ جاری رہا۔ آخر کار فقیہوں اور صوفیوں کے نزاع کے خاتمہ کی امام غزالی (المتوفی سنہ ۱۱۱۱ مسیحی) نے کوشش کی اور شریعت اور معرفت کی کڑیاں ملائیں۔ ان خارجی اور داخلی بحرانوں کے نتائج سماج اور راج دونو کے لیے غیر اطمینان بخش ثابت ہوئے۔ علما اور فقہا سماج اور راج کی رہنمائی ایک سخت گیر اور تنگ نظر قانونی نظام کے ذریعے کرنا چاہتے تھے جو سینکڑوں سال پرانے عرب سماج کے قوانین اور رسوم پر مبنی تھا۔ وہ عمل اور رسم میں قدیم قانون شریعت سے ہر انحراف کو خواہ کتنا ہی جزئی ہو مردود سمجھتے تھے۔ انھوں نے اجتہاد کے دروازے بالکل بند کر دیے تھے۔ اس کے برعکس صوفیاے کرام نے قانون کے بجاے محبت کو اپنا ہادی اور دستور بنا لیا تھا اور وہ اپنے اثر سے غیر مذاہب کے ساتھ رواداری کو ترقی دینے کے اور افکار و اعمال میں فراخ دلی برتنے کے حامی تھے۔ اس رواداری اور فراخ دلی کی مثالیں صوفی شعرا کے ہاں اکثر ملتی ہیں۔ مولانا رومی نے صوفی مذہب کے بارے میں کہا ہے۔

ایمان دگر و کیش محبت دگر است
پیغمبر عشق نے عجم است نے عرب است

عطار کا کہنا ہے۔

عشق را بو حنیفہ درس نگفت
شافعی را در و روایت نیست
عشق بستان و خویشتن بفروش
کہ نکو تر ازیں تجارت نیست

خسرو کی مشہور رباعی ہے۔

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ تن تار گشتہ حاجتِ زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آری آری می کنم با خلق و عالم کار نیست

عطار خسرو سے بھی سبقت لے گئے فرماتے ہیں :

مسلمانان من آن گبرم کہ بت خانہ بنا کردم
شدم بر بام بت خانہ دریں عالم ندا کردم
صلای کفر دادم شمارا اے مسلمانان
کہ من آن کہنہ بتہارا دگر بارہ جلا کردم

ممکن ہے ان اشعار اور تلمیحات پر اکبر کا شعر صادق آتا ہو۔

لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبر
مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح جھلک رہے ہیں

اسے جانے دیجیے مگر اس شعر کی کیا تاویل کی جائے؟

گر سرِ عشق خواہی از کفر و دیں گذر کن
جائی کہ عشق آمد چہ جای کفر و دین است

نظیری نے توحید اور شرک کے ڈانڈے اس طرح ملا دیے ہیں :

گر عکسِ روی خویش در آئینہ دیدئی
توحیدِ شیخ و شرکِ برہمن بجا شناس

ایک اور شاعر کہتا ہے :

این است طریقِ عشقِ جانانۂ ما
زنار بہ گردن و مسلمانی باش

مگر یہ مضمون تو بحرِ ذخار ہے، جتنے موتی چاہیے بٹور لیجیے۔ مزا بدلنے کے لیے ایک ہندو بھگت کا قطعہ بھی سن لیجیے۔ یہ کرشن کا دلدادہ تھا کہتا ہے:

रत्नाकरो हि भुवनं गृहणी च यद्मा
देयं किमस्ति भवने जगदीश्वराय ।
राधागृहीतमनसो मनसीऽस्ति दैन्यं
दत्तं मया निज मनस् तदिदं गृहाण ॥

تیرا محل تو رتنوں کی کھان ہے اور سری گھر والی پدما دولت کی دیوی۔ تجھے دینے کے قابل میرے پاس کیا چیز ہے۔ اے میرے ایشور۔ ہاں رادھا نے تیرا دل چھین لیا ہے اور تیرے پاس دل نہیں۔ لے میں اپنا دل دیتا ہوں اسے قبول کر۔

اس سلسلۂ کل تحریک کو خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی صورتِ حال سے مدد ملی جہاں مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت دین و ایمان کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں ملک کی لامنتہا پہنائی میں بکھری ہوئی تھی۔ ان جزیرہ نشینوں کو ہندو طرزِ معاشرت کا بحرِ بیکراں گھیرے ہوئے تھا۔ اقلیت اور اکثریت کے میل جول کو اس بات سے تقویت پہنچی کہ اس اسلامی ترک قوم کی مخصوص اور خاص عادتیں تھیں جن کے زیر اثر وہ سپہ سالار اور کماندار تھے جو ہندوستان میں آباد ہونے کے لیے ملک میں داخل ہوئے۔ اس کے علاوہ صوفیا اور علما کے باہمی اختلافوں نے بھی اس کو ہوا دی اور حکمراں طبقے کی حکمت عملی بھی فقہا کے ناقابل عمل نظریوں سے دور تھی۔

الغرض من چلے اور عالی حوصلہ سلطانوں کی حقیقت پسندی اور عشقِ خداوندی سے سرمست صوفیا کی فراخ مشربی نے ہندوستان کی تہذیب کی ترقی میں

ہندو اور مسلمان دونو کا ذہن ایک ہی قسم کے مسئلوں سے دوچار تھا۔ ہندو ویدانیتوں کی طرح مسلمان صوفی بھی انسانی زندگی کے راز کا حل تلاش کرنے میں لگے تھے۔ اس عالم میں انسان کے ظہور کے کیا معنی ہیں اور پھر انسان کے دینوی اور آخرت کے حساب سے کیا مقصد ہے۔ کیوں اس کا وجدان اخلاقی قوتوں کا میدان کارزار بنا ہوا ہے۔ کیا ذریعے ہیں جن سے اعلیٰ اور ادنیٰ تقاضوں کی کشمکش پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دائمی مسرت اور ابدی شادکامی کا سرچشمہ کہاں ہے، وہاں تک کس طرح رسائی ممکن ہے۔ ضبط نفس، ترکِ لذّات کا روحانی آزادی سے کیا تعلق ہے۔ آزادی کی جستجو کیوں ہے اور اس کے حصول کے وسیلے کیا ہیں۔ ان گہرے سوالوں سے دونوں کو یکساں دلچسپی تھی۔ گو یہ صحیح ہے کہ ان کے جواب ملتے جلتے تھے لیکن ان میں مذہبوں کی انفرادیت جھلکتی تھی۔

صوفی کے خیال میں یہ روحانی سفر ایک والہانہ عشق کی حیثیت رکھتا تھا جس کا راستہ کانٹوں کے جنگل سے ہو کر جاتا تھا اور ایسے مقامات سے گزرتا تھا جہاں قدم قدم پر ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہے۔ لیکن اگر ارادے میں تزلزل نہیں اور عزم صمیم ہے تو اسے طے کرنا اور اس منزل مقصود تک پہنچنا جو ہمیشہ رہنے والے جلال کا مقام ہے، یقینی ہے۔ جوش اور جذبے پر زور اور عقل و منطق کی تحقیر سالک کے امتیازی اوصاف ہیں، اس مسافر کے جس نے اپنا سب کچھ اللہ کو سونپ دیا ہے۔

عشق و عقل کے مجادلے کی شمس تبریزی نے تشریح یوں کی ہے:

عقل گوید شش جہت حداست و بیرون راہ نیست
عشق گوید راہ ہست و رفتہ ام من بارہا

عقل گوید پا منہ کاندر فنا جز خار نیست
عشق گوید عقل را کاندر تو است ایں خارہا

اور دعا مانگی ہے۔

اے شمس تبریزی بیا کز خودشدستم در عنا
آتش بزن عقل مرا بازم زسر دیوانہ کن

(علی دشتی، سیری در دیوان شمس۔ ص ۱۲۹)

ان جذبات و احساسات کو ذہن انسانی کے ان متلون حالات کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے جن کے بھڑکانے کا باعث عارضی اور فانی اشیا ہیں بلکہ ان کا مصداق انسان کے اندر وہ ربانی عنصر ہے جو خود اپنی حقیقت و ماہیت کے جاننے کا خواہاں ہے اور جو مطلق اور ابدی ہے۔ نیکی اور خیر کے جو اصول صوفی کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں وہ ارضی اور مادی نہیں، نہ وہ جن کے پورا ہونے سے عارضی مسرت حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ اس بھلائی کا تصوّر ہے جو غیر فانی روح کی صفت اور ہمیشہ رہنے والی اور ہمہ گیر ہے۔

عشق سے ہی حقیقتِ خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔ عشق ذہن کو توانائی اور حرکت اور زندگی کو گرم جوشی، زندہ دلی اور خود اعتمادی بخشتا ہے۔ عشق کی شراب انسان کو مست کرتی ہے اور اس کے دل کی وسعتوں کو وسیع تر۔ اس کے مقابلے میں علم جامد ہے۔ زمین سے وابستہ اور محض وقتی ہوتا ہے۔ عشق حیاتِ جاودانی ہے، علم زماں اور مکاں میں محدود اور اس لیے اپنی رسائیوں میں کوتاہ ہے۔

اسلام نے جذبات کو جو درجۂ اولیت دیا ہے اس کا مقابلہ کچھ کچھ ردسو کے

نظریے سے کیا جا سکتا ہے۔ اس نے بھی ذہن کے میلانوں اور احساسات پر زور دیا جس کی وجہ سے یورپ میں رومانوی تحریک کا آغاز ہوا۔ جذبات و احساسات کی قدر بڑھی اور فرد کی عظمت اتنی بلند ہوئی کہ وہ سماج کا مرکز بن گیا۔ فرد کی شخصیت ہی مساوات و جمہوریت کی جڑوں کی آبیاری کرتی ہے اور اس میں نسوانی آزادی کے حق بجانب ہونے کا راز بھی مضمر ہے۔ اسلام نے بھی ذات پات کی سختی سے مخالفت کی اور عورتوں اور غلاموں کے آزادانہ حقوق کو تسلیم کیا۔ یہی نہیں عشق قربت الٰہی میں زندہ رہنے کے لیے ایک صلائے عام ہے۔

صوفیا کرام کے عقیدوں نے ہندوستان کی تہذیب کی ثروت میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ مذہبی اور سماجی زندگی کی ترقی میں قابل تعریف کردار انجام دیا۔ توحیدِ باری پر واضح اور شدید ایمان رکھنے کی ترغیب دی اور عشق کی پُر زور تاکید کی کیونکہ عبادت کی روح اور عمل صالح کی وہی اصل ہے۔ انسانوں کی برابری کا اعلان، انفرادیت کی عظمت کا اعتراف اور نظام عالم کو الوہیت کا قوسِ نزول و عروج تسلیم کرنا، یہ سب تعلیمات ایسی تھیں جنھوں نے ذہنوں میں ہل چل ڈال دی۔ اگرچہ اربابِ علم مثلاً پنڈتوں میں کم نے ان نئے خیالات سے استفادہ کیا مگر اوسط طبقے کے ان لوگوں نے جو سنجیدگی کے ساتھ حق و صداقت کے جویا تھے، ان خیالات کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔

پُرانے اور نئے ہندو اور مسلم تہذیبوں کے دو چشموں کے سنگم سے قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں بھگتی کی تحریک کا آغاز ہوا۔

ترکوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا اور ان کے سلطانوں اور سرداروں نے جنھوں نے غارت گری کی مہموں کی قیادت کی اور ملک کے مختلف حصّوں

میں سلطنتیں قائم کیں، اسلام کا کلمہ بھی پڑھا تھا، وہ نمازیں بھی ادا کرتے تھے اور روزہ بھی رکھ لیتے تھے لیکن جزیات میں شرعی قاعدوں کے مطابق اہتمام و التزام نہیں کرتے تھے۔ مگر شریعت کے وہ احکام جو دنیوی معاملات سے متعلق تھے ان کے نہاد میں زیادہ سختی سے جاگزیں نہیں ہوئے تھے۔ ان کے علاقائی ماحول اور مخصوص اندازِ زندگی نے جس انفرادیت کو ترغیب دی تھی وہ اسلام قبول کرنے کے بعد اور قوی اور مستحکم ہوگئی تھی۔ مگر چونکہ اُن کا بچپن وسط ایشیا کی ناسازگار آب و ہوا میں اور رنگیلی زمین پر گزرا تھا، ان کی سیرت میں ایک ساتھ جنگی جوش اور حسن و جمال سے اُنسیت پیدا ہوگئی تھی اور وہ شروع ہی سے جفاکشی اور عیش پسندی کے خوگر تھے۔

ہندوستان کی دولت و ثروت انھیں یہاں کھینچ لائی مگر بعد میں وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اور وسط ایشیا سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے۔ اپنے اور ہندوستان کے مفاد کو ایک سمجھا اور اپنی قسمت اسی ملک کے ساتھ وابستہ کر دی۔ اب ان کے اصلی وطن والے پرائے ہو گئے۔ چنانچہ تیرھویں اور چودھویں صدی میں جب چنگیز، ہلاکو اور ان کے جانشینوں نے جب ہندوستان پر حملے کیے تو دلی کے سلطانوں نے ملک کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی مدافعانہ کارروائی کی پندرھویں صدی میں تیمور کا تغلقوں نے مقابلہ کیا۔ سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک مغل بادشاہ وسط ایشیا کے ازبکوں، ایران کے صفویوں اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جیسے حملہ آوروں سے برسرِ پیکار رہے۔ غرض یہ کہ زمانہ وسطیٰ کے سبھی شاہی خاندانوں نے بیرونی تجاوز کرنے والوں کا مقابلہ کیا جو سب مسلمان تھے اور ہندوستانی سلطانوں اور بادشاہوں کے ہم مذہب تھے۔

ہندوستان میں ان حکمرانوں کا پہلا کام امن وامان اور نظم و ترتیب قائم کرنا تھا لیکن انھوں نے ملک کے انتظامی ڈھانچے میں کم سے کم تبدیلی کی۔ اتنا ضرور کیا کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں اقتدار اور اختیار رکھنے والے منصبوں پر دیسی افسروں کے بجائے اپنے ہم قوم لوگوں کا تقرر کیا۔ لیکن دیہی علاقوں میں پرانے جاگیرداروں کی جاگیریں برقرار رکھیں۔ مال اور دیوان کے شعبے زیادہ تر پرانے ہندو عہدے داروں کے ہاتھ میں رہے اور ہندوؤں کے دیوانی اور شخصی معاملات کے تصفیے کی ذمّہ داری بھی ہندوؤں ہی کے سپرد تھی۔

مگر ان کی فتوحات کا سماجی تبدیلیوں پر زبردست اثر پڑا۔ جیسے جیسے سلطنتِ دہلی کی حدیں پھیلتی گئیں، ہندو سامراج کے امکانات کم ہوتے گئے اور جو ہندو ریاستیں اور رجواڑے بچے وہ ملک کے مغربی اور جنوبی علاقوں میں محدود ہو کر رہ گئے۔ جن ریاستوں نے اپنی خود مختاری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، وہ بھی شمالی ہند کی طاقت ور مسلم حکومتوں کے نفوذ سے بچ نہ سکیں۔ حکومت کی سرپرستی اور پشت پناہی کے ختم ہونے کے ساتھ برہمنوں اور چھتریوں کے اعلیٰ طبقے بھی اپنے اعزاز و اقتدار سے ایک حد تک محروم ہو گئے۔

لیکن اوسط درجے کے لوگوں، کاروباری طبقوں، تاجروں، مہاجنوں کاری گروں اور صنعت گروں نے اپنی دولت اور اثر کے ساتھ ساتھ اپنے مرتبے کو بڑھانے کے لیے موقع حاصل کیے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان حکمرانوں نے صدیوں بند رہنے کے بعد شمال مغربی راستے پھر کھول دیئے۔ ہندوستانی اور غیر ملکی سوداگروں نے تجارت کو فروغ دیا۔ اشیاء کے تبادلے اور درآمد و برآمد میں خوب ترقی ہو گئی۔ اگرچہ منگول حملہ آوروں کے

تباہ کن سیلاب نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں سارے مغربی ایشیا کو تہ و بالا کردیا لیکن وہ بھی اس تجارت اور رابطے پر اثر انداز نہ ہو سکا۔

سماج کے درمیانی طبقوں کے عروج نے جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے بھگتی مذہب کی تحریک کے لیے بنیادی کام کیا اور مغل سامراج کے شان دار تمدن اور پُرجلال تہذیب کے لیے زمین ہموار کی۔ اس کی پُرشکوہ تعمیریں، حیرت انگیز سنگ تراشی، مصوری، موسیقی اور ادب کے شاہ کار دونوں تہذیبوں کے ملاپ کا کرشمہ ہیں۔

یہ اس نظریے کی ہی دین تھی کہ قرون وسطیٰ میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے تھے، ریاست سارے ملک پر اپنے سیاسی اقتدار کے استعمال کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے مذہبی قانونوں، سماجی نظام اور اظہارِ خیال کی آزادی کا احترام کرتی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوؤں کے قدیم روایات کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آنے پایا اور اس لیے باہمی تعلقات میں تلخی پیدا نہیں ہوئی۔
ہندو اور مسلم آبادی کے کچھ طبقے ایسے بھی تھے جن پہ مذہبی تعصب کا اثر زیادہ نہ تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے متوسط طبقے تھے۔ انھیں سنسکرت اور عربی سے زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ نہ ہی کتابی علوم سے زیادہ رغبت تھی اس لیے انھیں طبقوں میں قدیم و جدید کے میل ملاپ کے سلسلے نے فروغ پایا۔ مسلم ذہن ہندوانہ رنگ روپ قبول کرنے لگا اور اس نے فارسی اور ترکی کی جگہ مقامی زبانوں کو سیکھنا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں نے عربی فارسی اور ترکی الفاظ کو مقامی محاوروں میں جگہ دی۔ اس لین دین کا منافع ہماری تہذیب کے خزانے میں اُردو زبان کی شکل میں شامل ہوا۔

ہندو مسلمان ایک دوسرے کے رسم و رواج سے آشنا ہوئے اور

دونوں میں خیال کی دو ندیاں جاری ہوئیں۔ ہندوؤں میں پرانی ہندو روایات نے اپنی قوت اور پائداری کو برقرار رکھا۔ تنکر، راما ، مدھو اور ولبھ جیسے قدیم فلسفے اور مذہب کے عظیم مفسّر پیدا کیے۔ دوسری طرف متوسط طبقے کے لوگوں نے بھگتی کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تحریک کے اندر حوصلہ و شوق کا نیا سرچشمہ یعنی خود سپردگی اور محبت کو پالیا۔ اس تحریک سے بہت سی نئی شاخیں پھوٹیں۔ انھوں نے خدا کی وحدت کا پرچار کیا۔ مورتیوں کی پرستش، زیارت گاہوں کی یاترا اور ظاہری رسوم کی پیروی کو غلط قرار دیا۔ روحانی نظم وضبط، انسان کی محبت اور خدمت، اجتماعی دعا اور عبادت، اعلیٰ اخلاق، تقدس اور پاکیزگی پر زور دیا۔ ذات پات کی تفریق اور اونچ نیچ کے عقیدوں کی مذمت کی۔ بھگتی کا یہ مذہب ایک آسان اور سہل مذہب تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس کے ذریعے سے اعلیٰ ترین روحانی سکون بغیر کسی ریاضت اور باطنی مشقّت کے حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ نہ تو مذہبی علوم کی عبوری شناسائی اور نہ مقدس کتابوں کی ورق گردانی کا قائل تھا، نہ ہی مذہبوں کے رسوم اور ظاہری عبادات کو اور نہ طولانی تقریبوں کو مانتا تھا۔ بھگتی نے اپنے پیروؤں پر ایک ان دیکھی اننت اور انجان حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور اس کے جلوے کو سب کے لیے حتی کہ سیدھے سادے، ان پڑھ غریبوں اور اچھوتوں کے لیے بھی عام کر دیا۔

جب بھگتی کی ندی میں باڑھ آئی تو پرانے فلسفے اور علم کے دھاروں میں پانی کم ہونے لگا۔ سولھویں صدی کے بعد سے مذہب اور گیان کے قدیم محافظوں اور سرپرستوں کی قوتیں گھٹنے لگیں۔ اگرچہ اس زمانے میں شرح اور حاشیے لکھنے والوں کو تو خاصا فروغ ملا۔ لیکن فلسفہ یا ادب میں کوئی نئی اور

اچھوتی چیز پیدا نہیں ہوئی۔

بھگتی کا مذہب بنیادی طور پر ایک ایسا نظام تھا جو جذبات کی پاکیزگی اور ترقی کا خواہاں تھا۔ اس نے ہمارے ذہنوں کی انفرادیت کو گہرا کیا۔ ذاتوں سے الگ ہو کر فردوں میں امتیاز کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ برخلاف پنڈتوں اور عالموں کے مذہب کے جو آفاقی اور منطقی اصولوں پر زیادہ زور دیتا تھا۔ مگر ساتھ ہی سماجی اونچ نیچ کا قائل تھا، بھگتی نے روحانی تجربے کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ ظاہر ہے کہ فرد کے ایسے تجربے میں دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ فرد کے اعلیٰ ترین مقصدوں کو حاصل کرنے کے لیے فرد کا سماج اور دنیاوی مشاغل سے ناتہ توڑ لینا ضروری ہے۔ اس کی بہترین مثال کبیر کی ہے۔ کبیر اپنے کرگھے پر بھی کام کرتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کو اپنا پیغام سنانے میں لگا رہتا تھا۔ یہی صورتِ حال کتنے ہی اور بھگتوں کی تھی۔

جس انفرادیت کی اہمیت پر تصوف اور بھگتی نے زور دیا، اس کے مختلف مدارج ہیں۔ اس کا کمال تو یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ایک بے مثل آزاد حیثیت کا مالک بن جائے۔ ہماری تاریخ کے منجھلے زمانے میں یہ تو نہ ہو سکا۔ تاہم اس کی حالت اس تتلی کے مانند ضرور تھی جو اپنے خول سے نکلنے والی ہو اور اپنے اردگرد لپٹے ہوئے تاروں کو توڑ کر باہر آنے کی کوشش کر رہی ہو۔ تاروں کا جال جسے قدما نے انسان کے چاروں طرف لپٹا رکھا تھا اب ٹوٹ رہا تھا، انفرادیت نہ صرف فکر و خیال کی دنیا میں بلکہ عملی زندگی میں بھی اپنے قیود کی فصیلیں ڈھا رہی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عہدِ قدیم کے مقابلے میں ہمیں عہدِ وسطیٰ کے فعال اور سرگرمِ عمل افراد کی زندگی کے بارے میں بہتات کے ساتھ معلومات حاصل ہیں۔ اس زمانے میں تاریخی

روزنامچے اور کتابیں ظہور میں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور ان کے صفحات میں شہنشاہوں، سپہ سالاروں، وزیروں، عالموں اور درویشوں کی شخصیتوں کے پیکر روشن ہونے لگتے ہیں۔ اب سلاطین دہلی اور مغل شہنشاہ محض قصوں کہانیوں کے دھندلے کردار نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر بابر کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ ایک باہمت، بے فکر، نڈر انسان تھا جو کبھی امید کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ زندہ دل آدمی تھا جسے زندگی سے لطف اندوز ہونے کی توفیق تھی۔ رات رات بھر شرابیں انڈھیلتا تھا لیکن نشے میں اپنے حواس کبھی نہیں کھوتا تھا۔ جب سب ساتھی چور ہو جاتے تو وہ صبح کا تڑکا ہوتے ہی اپنی خواب گاہ کی طرف پاؤں لڑکھڑائے بغیر چل دیتا تھا۔ اسے چمن زاروں، فواروں، جھرنوں اور آبشاروں، پھولوں اور پھلوں سے بے انتہا رغبت تھی۔ شاعر تھا، ترکی زبان میں شعر کہتا تھا اور اس نے اپنی دلچسپ یادداشتیں اپنی مادری زبان میں سپردِ قلم کی تھیں۔

ہمیں اکبر کے بارے میں علم ہے۔ پیدائش سے موت تک اس کی سوانح عمری کی ہر بات ہمارے سامنے ہے۔ وہ ایک عظیم سیاست داں اور بہادر جنرل تھا۔ نپولین کی طرح تیز رفتاری کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ وہ روحانی تجربہ کا شائق تھا۔ تلاشِ حق میں اس کی نظر وسیع تھی اور ذہن تحقیق کی طرف مائل تھا۔

ہم کشمیر کے زین العابدین سے بھی واقف ہیں جس کے خیال آسمانوں میں پرواز کرتے تھے، جس نے اکبر سے بھی پہلے مذہبی رواداری کا سبق سکھایا اور تمام بنی نوعِ آدم کے ساتھ محبت کا پیغام دیا۔

ہم دکن کے محمد قلی قطب شاہ جیسے ذہین اور جامع انسان کو بھی جانتے ہیں

جو زباں داں، شاعر، مدبر، ادب اور فن کا سرپرست، ہر طبقے اور فرقے کا
دوست اور ہمدرد تھا۔

ان کے علاوہ ہماری تاریخ میں سیاست داں، سپہ سالار، فاتح، رعایا پرور
ملک کی فلاح اور بہبود کا خیال رکھنے والے اور اپنے اعلیٰ اصولوں کو سینے سے
لگا کر ان پر عمل کرنے اور پھیلانے والے نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہیں جنھیں آج
ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ ان میں عالی دماغ اور وسیع النظر لوگ بھی
تھے اور کم نظر اور متعصب بھی۔ ان میں اچھے بھی تھے اور برے بھی۔ مگر وہ
سب حیرت انگیز طور پر ممتاز شخصیتوں کے مالک تھے۔

ان میں سب سے بڑھ کر تو مغلوں کی شخصیت ہے جس کی یادگاریں سارے
ملک میں بکھری پڑی ہیں۔ یہ جلال اور جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ آگرے کا
تاج محل فنِ تعمیر کا سرتاج ہے۔ مقبرے کا تصور ہی سراسر انفرادیت کے
جذبے پر منحصر ہے۔ مقبروں میں ہی نہیں مسجدوں، محلوں اور قلعوں میں بھی یہ
کارفرما ہے۔ اسی وجہ سے درباری معماروں، مصوروں، نقاشوں، کاریگروں
کے نام اور کارنامے سب کے سب محفوظ ہیں۔ جہانگیر جس کے زمانے میں مصوری
نے حسن و خوبی کی چوٹیوں کو چھو لیا تھا، اُن کے شاہ کاروں سے اتنی اچھی
واقفیت رکھتا تھا کہ ایک نظر میں بتا سکتا تھا تصویر کا خاکہ کس نے بنایا ہے
اور اس میں رنگ کس نے بھرا۔

موسیقی میں خسرو، بیجو اور تان سین جیسے استادوں کے کارنامے
ہندوستان میں اتنے ہی روشن ہیں جتنے یورپ میں باخ، موزارٹ اور
بیتھوون کے۔

مگر عہد وسطیٰ میں اگر انفرادیت کہیں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے

تو مذہب میں۔ درویشوں، عبادت گزاروں اور مصلحوں نے زمانے پر اپنے نقش الگ الگ ثبت کیے ہیں۔ مذہبی تجربات اور نظریات سے متعلق ان کی رائیں واضح طور پر الگ الگ دیکھی اور پہچانی جاسکتی ہیں۔ کبیر، نانک، چیتنیہ، تکارام، سور، تلسی، سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں گو یہ سب کے سب باطنی اور ابدی مسرت وسکون کی راہ میں ہم سفر بھی ہیں۔

یہی بات مسلمان درویشوں مثلاً معین الدین چشتی، فریدالدین گنج شکر، نظام الدین اولیا، بندہ نواز گیسو دراز، ملا شاہ وغیرہ کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ صوفی سلسلے قربت الہی کی جستجو، دولت وطاقت سے نفرت، غریبوں، دکھیاروں اور مصیبت زدوں سے محبت کی بنا پر قائم ہوئے۔ ان قابلِ احترام سلسلوں کے اپنے اپنے طور طریقے، روحانی نظم وضبط کے قاعدے ہیں اور ان پر ان بزرگوں کی انفرادیت کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس پر کسی کو شبہہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہندو بھگتوں کی مانند اگرچہ چشتیوں، سہروردیوں، قادریوں، نقش بندیوں وغیرہ کے بھی راستے الگ الگ تھے، پر منزل سب کی ایک تھی۔

ہندوستان نے اٹھارھویں صدی میں جوں ہی قدم رکھا روحانی طاقت اور سرگرمیٔ عمل کا زور گھٹنے لگا۔ زندگی میں روایتی انداز اور یکسانیت، ذہنوں میں سستی اور اخلاق میں گراوٹ آگئی۔ بلکہ ہابز کے الفاظ میں یوں کہیے کہ انسانی ذہن کی دو آمرانہ قوتوں یعنی بھوک اور جنس نے سارے سماج پر قبضہ کرلیا۔ ذہنی غلامی نے انسان کو آمادہ کیا کہ وہ دوررس مستقبل کے مقابلے میں حال کی منفعت کو اور اجتماعی مفاد کے سامنے انفرادی مفاد کو ترجیح دے۔ اس ذہنی غلامی نے خارجی غلامی کو دعوت دی۔ جو برطانوی سامراج کی

شکل میں نمودار ہوئی۔

تاریخ نے ورق الٹا۔ مشرق میں جمود آنے لگا اور وہ پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ مغرب ترقی کی راہوں پر گامزن ہوا۔ اس کی ترقی کا اصلی راز انسان کے ذہنی افق کی توسیع، قرون وسطیٰ کی کلیسائیت سے دماغوں کی آزادی، جاگیردارانہ نظام کی پابندیوں سے سماج کی نجات اور نئی سائنس اور نئی صنعتی تکنیک کے انکشاف میں ملتا ہے۔ اس آزادی نے انسان کی بے پناہ صلاحیتوں کو اُجاگر کر دیا۔ اب انسان نے فطرت کی طاقتوں پر قابو حاصل کر کے انھیں انسانی ترقی کے لیے استعمال کرنے پر کمر باندھی۔ قبائلی اور موروثی حد بندیوں کو ختم کیا۔ اور چھوٹے تنگ گھروندوں کو توڑا جن میں وہ ابھی تک محصور تھا اور ساتھ ہی ساتھ قومی سالمیت اور شخصی انفرادیت کو بھی فروغ دیا۔

سماجی نظام نے ایک نیا اور بہتر روپ اختیار کیا اور افراد میں خود اعتماد، خود اختیار، خود ہدایت، تنقید اور استدلال کی صلاحیتیں اُبھر آئیں جو فرد کی ذہنی آزادی کے ساتھ ساتھ سماجی ترقی کے لیے بھی بڑی مبارک ثابت ہوئیں۔ ترقی کی کبھی ختم نہ ہونے والی راہیں صرف معدودے چند کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے کھل گئیں۔ آزادی اور مساوات کے دروازوں تک انسان کی رسائی ہو گئی۔

مگر ہر سود کے ساتھ زیاں جڑا ہے۔ ترقی کے ساتھ کچھ نقصان بھی ہوئے جیسے جیسے انسان کی قوتیں خارجی دُنیا کی تسخیر، سماجی مشکلات اور ذہنی غلامی کے دفعیہ میں صرف ہونے لگیں۔ وہ اپنے باطن پر نظر ڈالنے، اپنی ذات کے مرکز کے ڈھونڈنے اور اصل حقیقت کو تلاش کرنے اور پہچاننے کی عادت کو چھوڑنے لگا۔ انسان جستجو کی اس راہ سے زیادہ دُور ہوتا گیا جس کی انتہا

خود شناسی اور لازوال مسرت ہے۔ دنیا کو دریافت کرنے کا شوق اور کامیابی کا غرور اس کی روح میں سرایت کر گیا۔ مشرق نے جس چیز کو نظر انداز کیا تھا مغرب نے اس کی طلب میں بڑے جوش و خروش، ذوق و شوق اور کامیابی کا اظہار کیا۔ اور مشرق کو اپنی ذہنی قوت سے مرعوب کر دیا۔

مغرب کے تصادم سے ہندوستان میں بھی تہذیبی تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مغرب نے ہمارے رواج اور روایت کے ڈھیلے اور بے حرکت اقتدار کو ہلا ڈالا۔ مگر اس کی شدید ضربوں نے ہندوستانی ذہن کی سمٹی اور سکڑی قوتوں کو رہا بھی کر دیا۔

رومان رولان کے الفاظ میں اس تبدیلی کی تعبیر یوں کر سکتے ہیں :۔

"تین ہزار سال سے نور کا ایک درخت اپنی ہزارہا شاخوں اور کروڑوں ٹہنیوں کے ساتھ اس گرم سرزمین میں، جسے دیوتاؤں کی جلتی ہوئی کوکھ کہیے، اُگا اور بڑھا۔ یہ پژمردگی کے آثار سے بالاتر رہ کر ہمیشہ سرسبز ہوتا رہا۔ اس کی ڈالیوں میں ایک ہی وقت میں ہر طرح کے پھل آئے۔ اس کی گود میں ہر قسم کے معبود پلے۔ بربری دیوتاؤں سے لے کر اس نورٌ علیٰ نورٍ تک۔ جو روپ، نام اور حدوں سے بے نیاز ہے لیکن اس کی اصلی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔"

ہندوستان کی شخصیت اور فرد کے نمو کا جلوہ برطانوی عہد سے پہلے ہی بادلوں کی اوٹ سے جھلکنے لگا تھا، مذہب، ادب، تاریخ اور اولوالعزم مردوں اور عورتوں کے کارناموں میں۔ لیکن فرد کے کمال پر اب تک سماجی، سیاسی اور تہذیبی نقابیں پڑی ہوئی تھیں جو اس کے مقتدر اور پرشکوہ اظہار کے راستے میں اب بھی

رکاوٹیں بنی ہوئی تھیں۔ ہمارے سماج میں بہت بڑی خامی یہ پیدا ہوگئی تھی کہ ہمیں اپنی گذشتہ روایات میں حقائق سے فرار نظر آنے لگا تھا۔ بجائے اس کے کہ داخلی اور خارجی دنیاؤں میں جن میں ایک جذبات اور خواہشات کی پُرشور دنیا اور دوسری طرف فطرت کی سرکش دنیا ہے۔ ہمارا ذہن دونوں کی تسخیر کی طرف برابر توجہ دے۔ ہندوستان نے پہلی دنیا کی طرف توجہ کی اور دوسری کو قریب قریب نظر انداز کر دیا۔ گویا اس انتخاب سے اپنی بے بضاعتی کا اقرار کر لیا۔ ہمارا یہ انتخاب ایک روحانی شکست کے برابر تھا۔

مغربی چیلنج نے ہندوستان کو اپنی غلطی کا احساس دلایا اور مغرب کا خاطر خواہ جواب دینے پر آمادہ کیا۔ لیکن حالت عجیب تھی کیونکہ انگریزوں کی مداخلت مسلمانوں کے برخلاف تند اور سخت گیر تو تھی ہی، تباہ کن بھی تھی۔ انھوں نے حاکم اور محکوم کے درمیان زبردست فاصلہ قائم کیا، ملک کو کبھی نہ اپنایا اور ہمیشہ اغیار کی طرح رہے۔ ہندوستانیوں نے ان کے اس اثر و اقتدار کے ردِعمل کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا۔ کچھ نے تو اس نئے خداوند کے آگے اطاعت اور فرماں برداری کا زانو ٹیک دیا۔ ان کی ہر ادا کی نقالی کرنے لگے اور اپنے آپ کو اپنے آقاؤں کے سانچے میں ڈھال لیا۔ یہ وہ شکست خوردہ لوگ تھے جن کا خود اپنے آپ پر یقین اور اعتماد ختم ہو چکا تھا۔

مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے پاؤں زمین پر جمے ہوئے تھے اور جنھوں نے طاقت کے سامنے سرخم کرنے اور مغرب کی برتری کے مغرورانہ دعووں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ہر اس چیز سے چمٹے رہے جو ان کی اپنی تھی۔ خواہ اچھی ہو یا بُری۔ یہ رجعت پرست لوگ تھے جو تبدیلی اور تغیر کو ملعون اور مردود سمجھتے تھے۔ مگر ماضی کو

پھر سے زندہ کرنے کے لیے آزادی کے خواہاں ضرور تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے برطانیہ کے چہرے سے خود ساختہ تہذیبی اور سیاسی برتری کا پردہ اٹھا دیا۔ انھوں نے اس انسانیت کو بے نقاب کیا جس کے نزدیک قوموں کی تفریق ایک دوسرے پر اقتدار قائم کرنے کا جواز نہیں ہو سکتی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ نسل، رنگ اور مذہب سے قطع نظر انسانی آتما ہر زمانے اور ہر خطّے میں اپنی اپنی جگہ بے مثال اور قابلِ احترام ہے۔ ان تینوں قسموں کے لوگوں میں ہندوستان کے تین ارتقائی مدارج جلوہ گر ہیں۔ نیا ہندوستانی خواہ مغرب کی طرف اس کا رویہ تسلیم و اطاعت کا ہو خواہ بغاوت کا۔ یا مغربیت کو اپنے میں سمو لینے کا۔ وہ اپنے ساتھ اپنا ماضی بھی لیے ہوئے ہے۔ لیکن فرد کے ایک نئے تصوّر کا خواہاں اور آرزومند ہے۔ اس کے اندر جو ہندو بیٹھا ہوا ہے اس سے کہتا ہے تیری اصل ربانی ہے۔ اس کے اندر جو چھپا ہوا مسلمان ہے اسے بتاتا ہے تیری ربانی حقیقت اصل دنیا کی نفی نہیں کرتی۔ بلکہ اس سے زور آزمائی اور اس پر غلبہ پانے پر اکساتی ہے۔ مغرب نے اسے سکھایا کہ عوام کا ایک رشتے میں پرونا، ساری سماج کو ایک سطح پر لانا، انفرادی صلاحیتوں کو ابھارنے کا وسیلہ اور باطنی اور ہمہ گیر سکون اور مسرت کے حصول کی ایک اہم منزل ہے۔

ہماری تاریخ میں انیسویں صدی ایک عظیم الشان انقلاب کی شہادت دیتی ہے۔ اس دور میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اس فکر اور نظر کو پھر سے زندہ کیا جس نے ہر دور میں ایک روشن ستارے کی طرح ہندوستان کی رہنمائی کی ہے۔ مگر اس محدود وقت میں صرف ان میں سے چند ہی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ رام موہن رائے۔ دیانند سرسوتی، رام کرشن پرم ہنس، سید احمد خاں

رابندرناتھ ٹیگور، محمد اقبال، موہن داس کرم چند گاندھی۔

رام موہن رائے بلا کے ذہین اور بے پناہ ہمت والے انسان تھے۔ ابتدائی انیسویں صدی کی یاس انگیز فضا میں جب کہ مسیحی مشنری اور انگریز افسر ہندوستانی تہذیب اور مذہبوں پر ہر طرف سے لعنت ملامت کی بوچھار کر رہے تھے انھوں نے عبرانی، یونانی، لاطینی اور انگریزی زبانوں میں مسیحی مذہبیات سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے معتقدات کا مواخذہ کیا۔ انھوں نے ہندو عقائد کی بنیاد صرف اپ نشدوں پر رکھی کیونکہ ان کے نزدیک اپ نشد انسان کے وجدانی اور عقلی پہلو کی تطبیق کرتے ہیں اور تمام ادنی اور اعلی افراد کو بلا استثنا اس دنیا میں زندگی کے کاروبار میں خدا کی باریابی کا یقین دلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو دعوت دی کہ روح کو پستی کی طرف لے جانے والے اندھے عقیدوں سے نجات حاصل کریں اور فرد کی قوت فیصلہ اور اپنی باطنی روشنی پر بھروسا کریں۔

دیانند سرسوتی نے ذات پات، توہمات اور مورتی پوجن کے خلاف بڑی دلیری کے ساتھ جہاد کیا۔ ان کی دعوت مغرب زدہ ہندوستانیوں سے زیادہ متوسط پڑھے لکھے طبقے اور ہندوستانی عوام کے لیے تھی۔ آریہ سماج کی تحریک کال ون (CALVIN) اور جون ناکس (JOHN KNOX) کی تحریکوں کی طرح بجلی کی رفتار سے پھیلی، اس نے انفرادی اور سماجی معاملات میں سخت رویہ اختیار کیا اور کال ونزم کی طرح روایت پرستی کے خلاف خود اعتمادی اور بغاوت کا پیغام دیا۔

رام کرشن ایک صوفی تھے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا خدا کا تصور ماں کا سا تھا جسے اپنے بچوں سے پیار

ہے۔ انھوں نے ہر انسان میں خدا کا عکس دیکھا اور اسی لیے اس اصول کا پرچار کیا۔" انسان پر رحم کو نہیں بلکہ اس کی خدمت کو ہی عبادت سمجھو۔" انھوں نے زندگی سے بھرپور محبت میں ڈوبی لیکن دکھیاری انسانیت میں اپنے آپ کو کھو دیا اور اس کھونے میں اپنے آپ کو پالیا۔

سید احمد خاں کی شخصیت انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کے افق پر اس وقت نمودار ہوئی جب کہ ہندوستان سنہ ستاون کی جنگِ آزادی کے زخموں سے چور تھا۔ انھوں نے ہندوستانی سماج کے ایک بڑے گروہ یعنی مسلمانوں کو روایت پرستی اور کورانہ تقلید کی دلدل سے نکالنے کا خواب دیکھا تھا۔ سید احمد خاں کی خواہش تھی کہ سائنس اور آزاد خیالی کی تازہ ہوائیں مسلمانوں تک پہنچیں۔ اور ان کے اندر زندگی کی نئی روح پھونکیں اور اس طرح جدیدیت سے بہرہ مند خود اعتمادی کی طاقت سے سرشار مسلمان اپنے آپ کو ہندوستان کے رنگا رنگ سماج اور مخلوط تہذیب میں اہم حصہ لینے کا اہل بنا لیں۔

ٹیگور ایک انقلابی شاعر اور ایک روشن ضمیر انسان تھے۔ ہندوستان جیسے پس ماندہ اور کچلے ہوئے ملک کے لیے جس کے جسم پر غلامی کی کسی ہوئی زنجیروں نے روح کو گھائل کر دیا تھا' وہ مسرت اور آزادی کا پیغام لے کر آئے۔ ان کے متعلق یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے افکار کو خود اُن ہی کے الفاظ میں پیش کر دیا جائے۔ فطرت کے حُسن کی مسرت اور ذاتِ حق سے فطرت کے رابطے کے بارے میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اُن کی نظم ہے:

"تو ہی آسماں ہے اور تو ہی آشیانہ بھی

اے حسن کے خداوہیں اس آشیانے میں تیرے پریم نے
روح کے گرد رنگوں اور آوازوں اور خوشبوؤں کی
چار دیواری بنا دی ہے
صبح ہوتی ہے اور وہ اپنے دائیں ہاتھ میں
تیرے حسن کے ہاروں سے بھری سنہری ٹوکری لیے
خاموشی کے ساتھ اترتی ہے
اور پھر شام آتی ہے خالی چراگاہوں سے گزرتی ہے جنھیں
ریوڑوں نے ترک کر دیا ہے۔ آتی ہے شام بے نشاں راستوں سے
مغرب کے شانت سمندر کے پانی کے ٹھنڈے
گھونٹوں سے بھرے طلائی سبو اٹھائے
لیکن جہاں اننت آسماں پھیلا ہے اور جہاں
آتما پرواز کرتی ہے، وہاں بے رنگ، بے داغ
نور کا راج ہے، وہاں نہ دن ہے نہ رات
نہ روپ ہے نہ رنگ اور نہ ہرگز ہرگز کوئی صدا"
ان کے آزادی کے خوابوں کی تعبیر سنیے:
"جہاں وجدان بے خوف ہے اور سر اونچا ہے
جہاں علم آزاد ہے
جہاں دنیا کو تنگ گھریلو دیواروں نے ٹکڑے ٹکڑے
نہیں کر دیا ہے
جہاں الفاظ سچائی کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں
جہاں خستگی سے بے نیاز کوشش اپنے بازو کمال کی

طرف پھیلاتی ہے
جہاں عقل کی پاکیزہ ندی بے جان رسموں کے
خشک ریتیلے خارزاروں میں راہ سے بھٹکتی
نہیں پھرتی
جہاں میرے پروردگار تو ہموارہ وسعت
پذیر خیال اور عمل کی ذہنیت کی طرف میری رہنمائی کرتا ہے
اے میرے پدر بزرگوار! اس آزادی کی بہشت
میں میرے وطن کو بیدار ہونے دے"

اقبال نے جو مصلح بھی تھا، فلسفی بھی اور شاعر بھی، ایک ایسا آتشیں منارہ روشن کیا جس کے شعلوں کی لپیٹ نے ہندوستانی ماحول میں آگ کی لہر دوڑا دی۔ اس کے پُرجوش اور بلیغ اشعار نے ہندوستانی نوجوانوں کے دماغوں کو یاس، فروتنی اور مطبیعت کے خلاف ورغلایا اور بغاوت کے چراغ جلائے۔ انسانیت، مردانگی اور عمل کی تلقین کی۔ پست ہمتی اور سفلہ پن کے خلاف جو نفاق اور بدگمانی کی ہوا دیتے ہیں، آواز اٹھائی ساتھ ہی کشادہ دلی اور انسانی محبت کی جو سرافرازی اور عظمت کا وسیلہ ہیں، تعلیم دی۔

گاندھی نے ٹیگور کے تخیل کو عملی شکل دی اور یہ واضح کیا کہ قدیم یوگ اور ذکر کے طریقے صرف آتما کے منور کرنے کا ہی ذریعہ نہیں ہیں بلکہ نفس کی نامعقول خواہشوں اور بے ہودہ کاوشوں سے نجات دلانے اور غیروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا بھی ذریعہ ہیں۔ وہ ایک کامل انسان کا نمونہ تھے، ایسا انسان جو عمل صالح کے ذریعے خدا کی ذات میں غرق ہوجاتا ہے۔

ان عظیم ہستیوں کا اثر ہندوستان کے خمیر میں سرگرم کار ہے۔ ہمارا ملک مشرق اور مغرب کا سنگم بن رہا ہے۔ یہاں مغرب کی انسان دوستی نے اپنا مسکن بنایا ہے۔ یہاں مشرق کے صدیوں پرانے ادراک کا گھر ہے۔ یہاں عقل اور عشق میں امتزاج کے چرچے ہیں۔ امید ہے مشرق اور مغرب کا میل ایک نیا انسان پیدا کرے گا، ایک عالمی انسان، ایک آزاد انسان اور اس کے شعور کا سرچشمہ خود شناس آتما کے کناروں کے درمیان بہتا ہوا زندگی کے ماورائی سمندر میں جا ملے گا۔ یہ فانی دنیا کے جوار بھاٹوں اور گردابوں سے گزرے گا، مگر ایک لافانی طاقت قوی اور خاموش نگہبان کی صورت میں اس کی قیادت کے لیے ہمراہ ہوگی اور وہ وقت آئے گا جب عالم انسانیت میں امن وامان کا دور دورہ ہوگا۔ قومیں، نسلیں اور مذاہب ایک خاندان کے افراد کی طرح مل جل کر رہیں گے اور پھر نہ مشرق ہوگا نہ مغرب اور تمام دنیا ایک ہوگی۔

اختتامیہ

ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دلیش مکھ

جناب وائس چانسلر صاحب، خواتین اور حضرات

آج کی شام ہم نے ہندوستانی تہذیب کے طویل جائزے کو جو تقریباً تین ہزار سال کی مدتِ مدید پر مشتمل ہے، مکمل کر لیا ہے۔ کل ہم اس تہذیبی ارتقا کی اس منزل تک پہنچے تھے جہاں ہم نے قدیم ہندوستانی تہذیب کو ۱۲۰۰ء کے قریب ختم ہوتے دیکھا تھا۔ جو باوجود مذہبی قیاس آرائیوں کی رفعت و بلندی کے بیرونی حملہ آوروں کے پیہم حملوں کی تاب نہ لا کر زمین پر آ رہی۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کے اٹوٹ اور غیر لچک دار سماجی نظام کی اساس اکثر حالات میں ایک بہت زیادہ محدود بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔

اپنے دوسرے لیکچر میں ڈاکٹر تاراچند صاحب نے ان مماثلتوں کی نشاندہی کی ہے جو اس نظام کے اور یورپ کے زرعی جاگیردارانہ نظام کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس مماثلت کے یوربی ہندو کو اندرونی اختلال و انتشار کا شکار ہونا پڑا۔ اس کے برخلاف ہندوستان کی جاگیرداری کو باہر سے آنے والے حملہ آوروں کے شدید صدمات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ بیرونی حملہ آور اگرچہ مسلمان ہونے کے مدعی تھے، تاہم کم و بیش اسی کے

دائرے کے اندر رہتے تھے۔ اس کے کچھ نتیجے بھی رونما ہوئے۔ حکمراں طبقہ اپنے ہمراہ اسلام کے بارے میں جو رجحان لایا وہ ظواہر پرستی ہی تک محدود تھا خود اپنے اندر کوئی پختہ اور مضبوط یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کی تلافی صوفی مفکرین نے کی۔ جو اپنے ساتھ مذہب کا وہ تصوّر لائے تھے جس میں جذبات کا عنصر غالب تھا اس نئے مذہبی رجحان کا عقائد اور اعمال دونوں پر اثر ہوا اور ان اثرات نے ہندوستانی مذہب کے ہمشکل دھاروں کے ساتھ مل کر اس تحریک کو نمایاں کرنے میں مدد دی جو بھگتی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ یورپی افکار کے متجانس رجحانات کے ساتھ چند در چند مماثلتیں رکھتی تھی جن کی واضح مثال روسو کی تحریروں میں ملے گی۔ ان تحریروں میں محبت کا نغمہ، عورتوں کی مساوات، یا ان کے مساوی حقوق کے اعلان کی شکل میں متشکل ہوجاتا ہے۔ میرے خیال میں ہماری ہندوستانی تہذیب کے مجموعی موقف کے بارے میں یہ ایک مخصوص ومتعین کارنامہ ہے۔ یہ بات اظہرمن الشمس ہے کہ روح جمہوریت کا بیشتر حصہ ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے جس پر دوسرے مذاہب سے کہیں زیادہ اسلام کی مذہبی کتابوں میں زور دیا گیا ہے بہر حال اس کا نتیجہ ایک طرح کے امتزاج کی شکل میں ظاہر ہوا جو ابتدائی منزل میں تھا اور اگر عمل تفکیر اپنی توانائی اور قوت کو کھو دیتا تو یہ چند مخصوص نتائج پر منتج ہوتا۔

لیکن اس ایک طرح کے ساکت وجامد ماحول پر مغربی افکار کی یورش ہوئی جو روحانی سے زیادہ مادی امور کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کا زیادہ زور فطرت کے مطالعے اور تسخیرِ کائنات پر تھا اور ان کا خصوصی مقصد ذہنی آزادی اور سماجی نظام کی تبدیلی تھا۔ اس یورش افکار کے نتیجے میں ہندوستانی تہذیب

کی دروں بینی کی قوت جو قدیم نظام کا جزو لاینفک تھی، بہت زیادہ کمزور ہو گئی بلکہ بعض حالات میں تو ختم ہی ہو گئی۔ اس کے برعکس کچھ زیادہ طاقتور عناصر بھی تھے جنھوں نے احیائیت پسندی پر اپنی بنیاد رکھ کر حریت فکر کے لیے سعی کی۔ یعنی اس حریت کی جو ایک تحریک کی حیثیت سے ان کی زنجیروں کو توڑ دے گی۔ دوسرے فکری رجحانات ہمہ گیر اور آفاقی نوعیت کے تھے جو عام انسانیت کے معاملات سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

یہ ماحول جس کے اندر کچھ با اثر اور اعلیٰ تخلیقی تحریک کے حامل اہلِ علم اور دیگر افراد نمودار ہوئے۔ کچھ نے راجہ رام موہن رائے کی طرح عالمانہ مطالعے کے بعد اپنشدوں کے افکار کی صداقت پر زور دیا، کچھ نے دیانند سرسوتی کی طرح خود اعتمادی سے کام لیا۔ کچھ نے رام کرشن پرم ہنس کی طرح (جن کے ساتھ میں ان کے شاگرد وویکانند کے نام کا بھی اضافہ کرتا ہوں) اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ انسان خالق کائنات کی صورت پر خلق ہوا ہے گویا کہ ہر انسان میں حقیقتِ خداوندی کا کچھ پرتو ہے اسی تعلیم سے بعد میں خدمتِ انسانی کے فریضے کا استنباط کیا گیا۔ جس سے بنی نوع کے ساتھ بھلائی کرنے کا نظریہ مراد ہے۔ پھر کچھ سر سید احمد خاں جیسے افاضل تھے جنھوں نے ایک محدود دائرے کے اندر ہندوستانی آبادی کے ایک حصّے کو پرانے رسم و رواج کی پابندی کے باعث روح حیات سے معطّل پایا اور اصولی طور پر آبادی کی حالت زار کو جدید تعلیم کے ذریعے سدھارنے کی کوشش کی۔

اس شاندار جماعت میں ٹیگور جیسے اکابر قوم کے ذریعے جو ایک انقلابی شاعر، ایک روشن ضمیر فرد اور ایک باغی معلّم تھے، نیز اقبال جیسے فلسفی شاعروں

کے ذریعے بھی اضافہ ہوا جنھوں نے بے علمی اور غلامانہ اطاعت کے خلاف بغاوت کے شعلوں کو بھڑکایا۔ اس سلسلۂ مشاہیر کا نقطۂ عروج گاندھی جی جیسی توی شخصیت کا ظہور تھا۔ جنھوں نے ٹیگور کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا اور انسان کو بتایا کہ اسے اعمال صالح کی مدد سے خدا کا قرب حاصل کرنا ہے۔

غرض یہ سطح جسے بیان کرنا تو آسان ہے مگر جس کا تجزیہ کرنا مشکل ہے ہندوستان کے جدید انسان کا کارنامہ ہے جس کو تہذیب سے ایک عجیب اور شاندار ورثہ ملا ہے اور شاید اسی ورثے کے ذریعے وہ اس مکمل انسان کے مقام کو پا سکے گا جس کے لیے امن عالم کے مقصد رفیع کا حصول مقدر ہو چکا ہے۔ میرے نزدیک یہ اس لیکچر کا خلاصہ ہے جس کے انگریزی ترجمے کو دیکھنے کا مجھے آج شرف حاصل ہوا یہ کسی قدر ایک طویل مربوط داستان ہے بااین ہمہ اس کو ایک بڑا دل کش علمی جائزہ کہنا چاہیے اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہماری تہذیب کے تین ہزار سال کی یہ داستان اور اس کے آخر میں ہم نے جو کچھ دیکھا ہے یقیناً وہ سب کی ہمت افزائی کرے گا اور سعی کے قدم کو آگے بڑھانے میں مدد دے گا۔

اس بیش قیمت رہنمائی کے لیے ہم فاضل مقرر ڈاکٹر تاراچند کے شکر گزار ہیں جن کے واسطے میں صمیم قلب سے شکریے کا ووٹ تجویز کرتا ہوں۔

شکریہ

ڈاکٹر محمد حسن

جنابِ صدر کی اجازت سے میں شعبۂ اُردو نظام اردو خطبات کی جانب سے اس سال کے مقرر اور ملک کے مقتدر اور مستند مورخ جناب ڈاکٹر تاراچند کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر تاراچند ہمارے دیدہ ور مورخ، نکتہ سنج تاریخ داں اور ہماری مشترک تہذیب کی بہترین اقدار کا حاصل ہیں۔ ہندوستانی کلچر کی بنیادی قدروں کی جستجو کا حق دراصل انھیں سے ادا ہو سکتا تھا انھوں نے اپنے خطبات میں تحلیل و تجزیے کی بے مثال قوت سے تاریخ ہندوستان اور اس کے تہذیبی دھوپ رنگ اس کے عروج و زوال اور امکانات کی داستان سے وہ نتیجے نکالے ہیں جو ادب کے طالب علموں کے لیے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے ہر ذمے دار شہری کے لیے اہم اور مفید ہیں۔

انھوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی تہذیب ایک نقطہ نہیں ہے ایک لکیر ہے جو مختلف رنگوں سے مل کر بنتی ہے، ایک بندھی ٹکی وحدت نہیں بلکہ مختلف دھاروں کا سنگم ہے۔ آج ہم ایک نہایت اہم دور سے گزر رہے ہیں، ہر لمحہ نئے سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ شاید سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آج ہندوستان کون سا تہذیبی رُخ اختیار کرے۔ آج ہندوستانی

تہذیب دوراہے پر کھڑی ہے۔ ڈاکٹر تاراچند صاحب نے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ ہماری تہذیب کے قدم اُسی وقت ڈگمگائے ہیں جو ہندوستانی اپنے کو جذباتی اور سماجی طور پر ایک رنگا رنگ وحدت کو اپنا نہیں سکے۔ جب وہ تنگ نظری یا تعصب، علاقہ یا ذات پات کی حد بندیوں میں اُلجھ کر یہ بھول گئے ہیں کہ ہندوستانی کلچر نے بے مثال وسعت قلب اور بے نظیر تاریخی تسلسل کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر تاراچند کا یہ خطبہ اس اعتبار سے تاریخ کا جائزہ نہیں تاریخ ساز کا کارنامہ ہے۔ آج کے ہندوستان کے لیے یہ بات اہم ہے کہ کلچر جبر نہیں اختیار ہے، ضابطہ بندی نہیں اجتماعی ملاپ کا نشان ہے۔ اس کی بنیاد قانون نہیں، دل ہے۔ اسی لیے کلچر کا دامن گل ہائے رنگیں سے لبریز ہوتا ہے اور اسی جلوۂ صد رنگ سے ہندستان نے بھی اپنی تہذیب کا آئینہ خانہ سجایا ہے اور اس قومی جذباتی یک جہتی کا ایک نشان اُردو زبان بھی ہے۔

ڈاکٹر تاراچند صاحب نے بجا طور پر اس بات کو واضح کیا ہے کہ اُردو یا عہد وسطیٰ کی مشترک ہندوستانی تہذیب دراصل ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں کے ملاپ کا نتیجہ تھی اور یہ بات فراموش کرنے کی نہیں ہے کہ یہ دونوں تہذیبیں نسلاً آریائی تھیں۔ دونوں کے عقائد، اقدار، مزاج اور منہاج ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے اور اسی لیے اُردو جس تہذیب کی علم بردار ہے اسے دراصل دو آریائی تہذیبوں کے ملاپ کا نتیجہ قرار دینا چاہیے۔

ہندوستانی کلچر کا کارواں ہر دور میں نئے روپ رنگ سے آگے بڑھتا رہا ہے اور اس کا تاریخی ارتقا مختلف اور متضاد اکائیوں میں نہیں ہوا بلکہ ایک تاریخی تسلسل کی شکل میں ہوا۔ اس کی اپنی رنگارنگی بھی ہے اور وحدت بھی

اور اس تاریخی سفر میں اس نے عالمی تہذیب سے وہ بے خبر نہیں گزری ہے اس وسیع اور عظیم اور عظیم الشان وحدت کا تصور ڈاکٹر تاراچند صاحب نے جن الفاظ میں کیا ہے وہ ان کے عارفانہ طرزِ فکر اور تاریخی بصیرت کا ثبوت ہیں اقبال نے اسی مرحلے کو اس طرح بیان کیا تھا۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصۂ جدید و قدیم

ڈاکٹر تاراچند صاحب اس فکر انگیز کارنامے کے لیے ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ڈاکٹر تاراچند جیسے مقتدر اور مستند مورخ کا تعاون ہمیں حاصل ہو سکا۔ دراصل نظام اُردو خطبات کا یہ سلسلہ ایک ولولہ انگیز، حوصلہ نواز علمی مہم کا آغاز ہے جس کا خواب دلّی کالج کے ماسٹر رام چندر اور سر سید احمد خاں جیسے مبصروں نے دیکھا تھا یعنی ہماری مادری زبان اُردو میں علمی کارناموں کا قابلِ فخر سرمایہ موجود ہو اور ہم بھی سائنس، ٹکنالوجی، اقتصادیات، فلسفہ اور عمرانیات جیسے سماجی علوم کے متعلق علمی تصانیف پیش کریں۔ نظام خطبات کے اس سلسلے کے ہر خطبے کے ساتھ ہمارے سرمایے میں اضافہ ہو رہا ہے اور تراکیب، اصطلاحات اور اندازِ بیان میں نیا علمی انداز پیدا ہو رہا ہے جس کے لیے ہمیں ڈاکٹر تاراچند کا ممنون ہونا چاہیے۔

میں ڈاکٹر سی۔ ڈی دیش مکھ صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے کرمِ بے حساب کا شمار دشوار ہے۔ انھوں نے اپنی عنایتوں سے ہم سب کے دل جیت لیے ہیں اور ان کی نوازش اور توجہ سے شعبۂ اُردو کو اپنے کاموں میں رہ نمائی اور حوصلہ ملا ہے۔ میں جناب وائس چانسلر صاحب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود نظام اُردو خطبات میں شرکت

فرمائی۔

اس کے علاوہ ان تمام بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ان جلسوں کے اہتمام و انتظام میں ہاتھ بٹایا اور ان جلسوں میں شرکت فرمائی۔ دہلی کو فاصلوں کا شہر کہا جاتا ہے جن لوگوں نے علم و ادب کی خاطر اور ہماری درخواست پر ان فاصلوں کو طے کیا اور ان فاصلوں کو قربتوں میں تبدیل کر دیا، اُن سب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ شعبے کے کاموں میں آئندہ بھی ان کا تعاون اور توجہ حاصل ہوتی رہے گی۔